میں لوگوں کے پاس جو قرآن شریف متفرّق طور پر لکھا ہوا تھا اور جو ان حضرات صحابۂ کرام کے سینوں میں بھی محفوظ تھا، سب کو تلاش کر کے جمع کیا۔[1]

ف: اس قصّہ میں اوّل تو ان حضرات کے اِتّباع کا اہتمام معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ کا منتقل کرنا ان کے لئے اس سے سہل تھا کہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ اس کے بعد کلامِ پاک کا جمع کرنا جو دین کی اصل ہے، اللہ نے ان حضرات کے اعمال نامہ میں رکھا تھا۔ پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اتنا اہتمام اس کے جمع فرمانے میں کیا کہ کوئی آیت بغیر لکھی ہوئی نہیں لیتے تھے۔ جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی لکھی ہوئی تھیں ان ہی سے جمع کرتے تھے اور حفاظ کے سینوں سے اس کا مقابلہ کرتے تھے اور چونکہ تمام قرآن شریف متفرّق جگہوں میں لکھا ہوا تھا، اس لئے اس کی تلاش میں گو محنت ضرور کرنا پڑی مگر سب مل گیا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جن کو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ پاک کا سب سے زیادہ ماہر بتایا ان کی اعانت کرتے تھے۔ اس محنت سے کلام اللہ شریف کو ان حضرات نے سب سے پہلے جمع فرمایا۔

(۸) حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی احتیاط روایتِ حدیث میں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے مشہور صحابہ میں ہیں اور ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار ہیں جو فتویٰ کے مالک تھے۔ ابتدائے اسلام ہی میں مسلمان ہو گئے تھے اور حبشہ کی ہجرت بھی کی تھی۔ تمام غَزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک رہے ہیں اور مخصوص خادم ہونے کی وجہ سے صاحبُ النَّعل، صاحبُ الوِسادۃ، صاحبُ المِطہرۃ (جوتے والے، تکیہ والے، وضو کے پانی والے) یہ القاب بھی ان کے لئے ہیں۔ اس لئے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خدمتیں اکثر ان کے سپرد رہتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کے بارے میں یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ امیر بناؤں تو عبداللہ بن مسعود کو بناؤں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد تھا کہ تمہیں ہر وقت حاضری کی اجازت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف بالکل ایسی طرح پڑھنا ہو جس طریقہ سے اُترا ہے تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے طریقہ کے موافق پڑھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ابنِ مسعود جو حدیث تم سے بیان کریں اس

[1] درّ

کو سچ سمجھو۔ ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ جب یمن سے آئے تو ایک زمانہ تک ابنِ مسعود کو اہلِ بیت میں سے سمجھتے رہے، اس لئے کہ اتنی کثرت سے ان کی اور ان کی والدہ کی آمد و رفت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں تھی جیسے گھر کے آدمیوں کی ہوتی ہے،[1] لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابو عمرو شیبانی کہتے ہیں کہ میں ایک سال تک ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس رہا۔ میں نے کبھی ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بات کرتے نہیں سنا، لیکن کبھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی بات منسوب کر دیتے تھے تو بدن پر کپکپی آ جاتی تھی۔ عمرو بن میمون کہتے ہیں کہ میں ہر جمعرات کو ایک سال تک ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس آتا رہا، میں نے کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے بات کرتے نہیں سنا۔ ایک مرتبہ حدیث بیان فرماتے ہوئے زبان پر یہ جاری ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تو بدن کانپ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے، پیشانی پر پسینہ آ گیا، رگیں پھول گئیں اور فرمایا: ان شاء اللہ یہی فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب تھا یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم۔[2]

ف: یہ تھی ان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی احتیاط حدیث شریف کے بارے میں، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو میری طرف سے جھوٹ نقل کرے، اپنا ٹھکانا جہنّم میں بنا لے، اس خوف کی وجہ سے یہ حضرات باوجود یکہ مسائل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور حالات ہی سے بتاتے تھے، مگر یہ نہیں کہتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ خدانخواستہ جھوٹ نہ نکل جائے۔ اس کے بالمقابل ہم اپنی حالتیں دیکھتے ہیں کہ بے دھڑک، بے تحقیق حدیث نقل کر دیتے ہیں، ذرا بھی نہیں جھجکتے، حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے بات کا نقل کرنا بڑی سخت ذمہ داری ہے۔ فقہ حنفی انہی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے زیادہ تر لیا گیا ہے۔

(۹) حضرت اَبو الدَّرداء رضی اللہ عنہ کے پاس حدیث کیلئے جانا

کثیر بن قیس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس دمشق کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا، ایک شخص ان کی خدمت میں آئے اور کہا کہ میں مدینہ منورہ سے صرف ایک حدیث کی وجہ سے آیا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آپ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

---

[1] بخاری، [2] مقدمہ او جز و مسند احمد

ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے پوچھا کوئی اور تجارتی کام نہیں تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا کہ کوئی دوسری غرض تو نہ تھی؟ کہا: نہیں، صرف حدیث ہی معلوم کرنے کے لئے آیا ہوں۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ کہ جو شخص کوئی راستہ علم حاصل کرنے کے لئے چلتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ اس کیلئے جنّت کا راستہ سہل فرما دیتے ہیں اور فرشتے اپنے پَر طالبِ علم کی خوشنودی کے واسطے بچھا دیتے ہیں اور طالبِ علم کے لئے آسمان زمین کے رہنے والے استغفار کرتے ہیں، حتیٰ کہ مچھلیاں جو پانی میں رہتی ہیں وہ بھی استغفار کرتی ہیں اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسا کہ چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر ہے اور علماء انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کسی دینار و درہم کا وارث نہیں بناتے بلکہ علم کا وارث بناتے ہیں، جو شخص علم کو حاصل کرتا ہے وہ ایک بڑی دولت کو حاصل کرتا ہے۔[1]

ف: حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فقہائے صحابہ میں ہیں۔ حکیمُ الامّت کہلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے وقت میں تجارت کیا کرتا تھا۔ میں نے مسلمان ہونے کے بعد چاہا کہ تجارت اور عبادت دونوں کو جمع کروں، مگر دونوں اکٹھی نہ رہ سکیں تو مجھے تجارت چھوڑنا پڑی۔ اب میرا دل یہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ بالکل دروازہ ہی پر دکان ہو جس کی وجہ سے ایک بھی نماز فوت نہ ہو اور روزانہ چالیس دینار کا نفع ہو اور میں ان سب کو صدقہ کردوں۔ کسی نے پوچھا کہ ایسی تجارت سے کیوں خفاء ہوئے کہ نماز بھی نہ جائے اور اتنا نفع روزانہ کا اللہ کے راستے خرچ ہو، پھر بھی پسند نہیں کرتے؟ فرمایا: حساب تو دینا ہی پڑے گا۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مجھے موت سے محبّت ہے اپنے مولیٰ سے ملاقات کے شوق میں، اور فقر سے محبّت ہے تواضع کے واسطے، اور بیماری سے محبّت ہے گناہ دھلنے کے واسطے[2]۔ اوپر کے قصّہ میں ایک حدیث کی خاطر اتنا طویل سفر کیا ہے۔ ان حضرات کے ہاں حدیث حاصل کرنے کے لئے سفر کرنا کچھ اہم نہیں تھا، ایک ایک حدیث سننے اور معلوم کرنے کے لئے دور دور کا سفر طے کر لینا ان حضرات کو بہت سہل تھا۔ شعبی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور محدّث ہیں، کوفہ کے رہنے والے ہیں۔ اپنے کسی شاگرد کو ایک مرتبہ

---

[1] ابن ماجہ، [2] تذکرہ

حدیث سنائی اور فرمایا کہ لے، گھر بیٹھے مفت مل گئی، ورنہ اس سے کم کے لئے بھی مدینہ منورہ کا سفر کرنا پڑتا تھا کہ ابتدا میں حدیث کا مخزن مدینہ طیّبہ ہی تھا۔ علمی شغف رکھنے والے حضرات نے بڑے بڑے طویل سفر علم کی خاطر اختیار فرمائے ہیں۔

سعید بن المُسیَّب رحمۃ اللہ علیہ جو ایک مشہور تابعی ہیں کہتے ہیں کہ میں ایک ایک حدیث کی خاطر راتوں اور دنوں پیدل چلا ہوں۔ امام الائمہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے۔ ۲۰۵ھ میں یعنی گیارہ سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کی تھی۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی سب تصانیف بچپن ہی میں حفظ کر لی تھیں۔ اپنے شہر میں جتنی احادیث مل سکیں ان کو حاصل کر لینے کے بعد ۲۱۶ھ میں سفر شروع کیا۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا، اس وجہ سے یتیم تھے، والدہ سفر میں ساتھ تھیں۔ اس کے بعد بلخ، بغداد، مکّہ مکرمہ، بصرہ، کوفہ، شام، عَسقلان، حمص، دمشق؛ ان شہروں میں گئے اور ہر جگہ جو ذخیرہ حدیث کا مل سکا حاصل فرمایا اور ایسی نوعمری میں استادِ حدیث بن گئے تھے کہ منہ پر داڑھی کا ایک بال بھی نہ نکلا تھا۔ کہتے ہیں کہ میری اٹھارہ برس کی عمر تھی جب میں نے صحابہ اور تابعین کے فیصلے تصنیف کئے۔ حاشد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ایک ساتھی کہتے ہیں کہ امام بخاری ہم لوگوں کے ساتھ استاد کے پاس جایا کرتے۔ ہم لوگ لکھتے اور بخاری ویسے ہی واپس آ جاتے۔ ہم نے کئی روز گذر جانے پر ان سے کہا کہ تم وقت ضائع کرتے ہو، وہ چپ ہو گئے۔ جب کئی مرتبہ کہا تو کہنے لگے کہ تم نے دِق ہی کر دیا۔ لاؤ، تم نے کیا لکھا؟ ہم نے اپنا مجموعۂ احادیث نکالا جو پندرہ ہزار حدیثوں سے زیادہ مقدار میں تھا۔ انہوں نے اس سب کو حفظ سنا دیا۔ ہم دَنگ رہ گئے۔

(۱۰) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا انصاری کے پاس جانا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد میں نے ایک انصاری سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تو وصال ہو گیا۔ ابھی تک صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بڑی جماعت موجود ہے۔ آؤ ان سے پوچھ پوچھ کر مسائل یاد کریں۔ ان انصاری نے کہا: کیا ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے ہوتے ہوئے بھی لوگ تم سے مسئلہ پوچھنے آئیں گے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی جماعت موجود ہے۔ غرض ان صاحب نے تو ہمت

کی نہیں۔ میں مسائل کے پیچھے پڑ گیا اور جن صاحب کے متعلق بھی مجھے علم ہوتا کہ فلاں حدیث انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، ان کے پاس جاتا اور تحقیق کرتا۔ مجھے مسائل کا بہت بڑا ذخیرہ انصار سے ملا۔ بعض لوگوں کے پاس جاتا اور معلوم ہوتا کہ وہ سو رہے ہیں تو اپنی چادر وہیں چوکھٹ پر رکھ کر انتظار میں بیٹھ جاتا۔ گو ہوا سے منہ پر اور بدن پر مٹی بھی پڑتی رہتی، مگر میں وہیں بیٹھا رہتا۔ جب وہ اٹھتے تو جس بات کو معلوم کرنا تھا وہ دریافت کرتا۔ وہ حضرات کہتے بھی کہ تم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی ہو کر کیوں تکلیف کی، مجھے بلا لیتے، مگر میں کہتا کہ میں علم حاصل کرنے والا ہوں، اس لئے میں ہی حاضر ہونے کا زیادہ مستحق تھا۔ بعض حضرات پوچھتے کہ تم کب سے بیٹھے ہو؟ میں کہتا: بہت دیر سے۔ وہ کہتے کہ تم نے برا کیا، مجھے اطلاع کر دیتے۔ میں کہتا: میرا دل نہ چاہا کہ تم میری وجہ سے اپنی ضروریات سے فارغ ہونے سے پہلے آؤ، حتیٰ کہ ایک وقت میں یہ بھی نوبت آئی کہ لوگ علم حاصل کرنے کے واسطے میرے پاس جمع ہونے لگے، تب ان انصاری صاحب کو بھی قلق ہوا، کہنے لگے کہ یہ لڑکا ہم سے زیادہ ہوشیار تھا۔[1]

مختلف علمی کارنامے

ف: یہی چیز تھی جس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو اپنے وقت میں حَبرُ الامۃ اور بحرُ العلم کا لقب دلوایا۔ جب ان کا وصال ہوا تو طائف میں تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ محمد رضی اللہ عنہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور فرمایا کہ اس امت کا امامِ ربّانی آج رخصت ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما آیتوں کے شانِ نزول جاننے میں سب سے ممتاز ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو علماء کی ممتاز صف میں جگہ دیتے تھے۔ یہ سب اسی جانفشانی کا ثمرہ تھا۔ ورنہ اگر یہ صاحبزادگی کے زعم میں رہتے تو یہ مراتب کیسے حاصل ہوتے۔ خود آقائے نامدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جن سے علم حاصل کرو ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔ ''بخاری'' میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ جو شخص پڑھنے میں حیا کرے یا تکبّر کرے، وہ علم حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت علی کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہٗ کا ارشاد ہے کہ جس شخص نے مجھ کو ایک حرف بھی پڑھا دیا میں اس کا غلام ہوں خواہ وہ مجھے آزاد

---

[1] دارمی

کردے یا بیچ دے۔ یحییٰ بن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ علم تن پروری کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص علم کو بے دلی اور استغنا کے ساتھ حاصل کرے، وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہاں جو شخص خاکساری اور تنگ دستی کے ساتھ حاصل کرنا چاہے وہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ مُغیرۃ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ اپنے استاد ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے ایسے ڈرتے تھے جیسا کہ بادشاہ سے ڈرا کرتے ہیں۔ یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدِّث ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ان کے متعلق کہتے ہیں کہ محدثین کا جتنا احترام وہ کرتے تھے اتنا کسی دوسرے کو کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ جو استاد کی قدر نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہوتا۔ اس قصّہ میں جہاں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اساتذہ کے ساتھ تواضع اور انکساری معلوم ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی علم کا شغف اور اہتمام بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص کے پاس کسی حدیث کا ہونا معلوم ہوتا، فوراً جاتے اس کو حاصل فرماتے خواہ اس میں کتنی ہی مشقت، محنت اور تکلیف اٹھانا پڑتی اور حق یہ ہے کہ بے محنت اور مشقت کے علم تو درکنار معمولی سی چیز بھی حاصل نہیں ہوتی اور یہ تو ضربُ المَثَل ہے ”مَنْ طَلَبَ الْعُلٰی سَهِرَ اللَّيَالِيْ“ ”جو شخص بلند مرتبوں کا طالب ہوگا راتوں کو جاگے گا۔“ حارث بن مغیرہ یزید، ابن شُبرمہ، قعقاع، مغیرہ رحمۃ اللہ علیہم: چاروں حضرات عشاء کی نماز کے بعد علمی بحث شروع کرتے، صبح کی اذان تک ایک بھی جدا نہ ہوتا۔

لَیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ عشاء کے بعد باوضو بیٹھ کر حدیث کا سلسلہ شروع فرماتے تو صبح کردیتے۔[1] دَرَاوَرْدِی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے دیکھا کہ مسجدِ نبوی میں عشاء کے بعد سے ایک مسئلہ میں بحث شروع فرماتے اور وہ بھی اس طرح کہ نہ کوئی طعن و تشنیع ہوتی، نہ تغلیظ اور اسی حالت میں صبح ہوجاتی اور اسی جگہ صبح کی نماز پڑھتے۔[2] ابن فُرات بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک محدث ہیں۔ جب انتقال ہوا تو اٹھارہ صندوق کتابوں کے چھوڑے جن میں سے اکثر خود اپنے قلم کی لکھی ہوئی تھیں اور کمال یہ ہے کہ محدثین کے نزدیک صحتِ نقل اور عمدگیٔ ضبط کے اعتبار سے ان کا لکھا ہوا حجّت بھی ہے۔ ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدث ہیں۔ تین سال کی عمر میں باپ نے

---

[1] دارمی، [2] مقدمہ

مفارقت کی، یتیمی کی حالت میں پرورش پائی، لیکن محنت کی حالت یہ تھی کہ جمعہ کی نماز کے علاوہ گھر سے دور نہیں جاتے تھے۔ ایک مرتبہ منبر پر کہا کہ میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔ ڈھائی سو سے زیادہ خود ان کی اپنی تصنیفات ہیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی وقت ضائع نہیں جاتا تھا۔ چار جُزو روزانہ لکھنے کا معمول تھا۔ درس کا یہ عالَم تھا کہ مجلس میں بعض مرتبہ ایک لاکھ سے زیادہ شاگردوں کا اندازہ کیا گیا۔ امراء، وزراء، سلاطین تک مجلس درس میں حاضر ہوتے تھے۔

ابنِ جوزی رحمۃ اللہ علیہ خود کہتے ہیں کہ ایک لاکھ آدمی مجھ سے بیعت ہوئے اور بیس ہزار میرے ہاتھ پر مسلمان ہوئے ہیں۔ اس سب کے باوجود شیعوں کا زور تھا۔ اس وجہ سے تکلیفیں بھی اٹھانا پڑیں[1]۔ احادیث لکھنے کے وقت میں قلموں کے تراشے جمع کرتے رہتے تھے۔ مرتے وقت وصیّت کی تھی کہ میرے نہانے کا پانی اسی سے گرم کیا جائے۔ کہتے ہیں کہ صرف غسل میت کے پانی گرم کرنے ہی کے لئے کافی نہ تھا بلکہ گرم کرنے کے بعد بچ بھی گیا تھا۔ یحیٰی بن مَعین رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے مشہور استاذ ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے دس لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔

ابنِ جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ مشہور مُورِّخ ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمۃ اللہ علیہم کے احوال کے ماہر، چالیس سال تک ہمیشہ چالیس ورق روزانہ لکھنے کا معمول تھا۔ ان کے انتقال پر شاگردوں نے روزانہ کی لکھائی کا حساب لگایا تو بلوغ کے بعد سے مرنے تک چودہ ورق روزانہ کا اوسط نکلا۔ ان کی تاریخ مشہور ہے، عام طور سے ملتی ہے۔ جب اس کی تصنیف کا ارادہ ظاہر کیا تو لوگوں سے پوچھا کہ تمام عالَم کی تاریخ سے تم لوگ بہت خوش ہو گے؟ لوگوں نے پوچھا کہ اندازاً کتنی بڑی ہوگی؟ کہنے لگے کہ تقریباً تیس ہزار ورق پر آئے گی۔ لوگوں نے کہا: اس کے پورا کرنے سے پہلے عمریں فنا ہو جائیں گی۔ کہنے لگے کہ انّا للہ، ہمتیں پست ہو گئیں اس کے بعد مختصر کیا اور تقریباً تین ہزار ورق پر لکھی۔ اسی طرح ان کی تفسیر کا بھی قصّہ ہوا۔ وہ بھی مشہور ہے اور عام طور سے ملتی ہے۔ دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے مشہور مصنّف ہیں۔ حدیث حاصل کرنے کے لئے بغداد، بصرہ، کوفہ، واسِط، مصر اور شام کا

---

[1] تذکرہ

سفر کیا۔ ایک مرتبہ استاذ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ استاذ پڑھ رہے تھے اور یہ کوئی کتاب نقل کر رہے تھے۔ ایک ساتھی نے اعتراض کیا کہ تم دوسری طرف متوجہ ہو۔ کہنے لگے کہ میری اور تمہاری توجہ میں فرق ہے، بتاؤ استاذ نے اب تک کتنی حدیثیں سنائیں، وہ سوچنے لگے۔ دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ شیخ نے اٹھارہ حدیثیں سنائی ہیں۔ پہلی یہ تھی، دوسری یہ تھی، اسی طرح ترتیب وار سب کی سب مع سند کے سنادیں۔ حافظ اثرم رحمۃ اللہ علیہ ایک محدِث ہیں۔ احادیث کے یاد کرنے میں بڑے مَشّاق تھے۔ ایک مرتبہ حج کو تشریف لے گئے۔ وہاں خراسان کے دو بڑے استاذ حدیث آئے ہوئے تھے اور حرم شریف میں دونوں علیحدہ علیحدہ درس دے رہے تھے۔ ہر ایک کے پاس پڑھنے والوں کا ایک بڑا مجمع موجود تھا۔ یہ دونوں کے درمیان بیٹھ گئے اور دونوں کی حدیثیں ایک ہی وقت میں لکھ ڈالیں۔ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدّث ہیں۔ حدیث حاصل کرنے میں ان کی محنتیں مشہور ہیں۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے چار ہزار استاذوں سے حدیث حاصل کی ہے۔ علی بن الحسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک رات سخت سردی تھی۔ میں اور ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ مسجد سے عشاء کے بعد نکلے۔ دروازہ پر ایک حدیث میں گفتگو شروع ہوگئی۔ میں کچھ کہتا رہا، وہ بھی فرماتے رہے۔ وہیں کھڑے کھڑے صبح کی اذان ہوگئی۔ حُمیدی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور محدِث ہیں جنہوں نے بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث کو ایک جگہ جمع بھی کیا ہے۔ رات بھر لکھتے تھے اور گرمی کے موسم میں جب گرمی بہت ستاتی تو ایک لگن میں پانی بھر لیتے اور اس میں بیٹھ کر لکھتے۔ سب سے الگ رہتے تھے۔ شاعر بھی ہیں، ان کے شعر ہیں۔

لِقَاءُ النَّاسِ لَيْسَ يُفِيْدُ شَيْئًا سِوَى الْهَذْيَانِ مِنْ قِيْلٍ وَقَالٍ

فَاَقْلِلْ مِنْ لِقَاءِ النَّاسِ اِلَّا لِاَخْذِ الْعِلْمِ اَوْ اِصْلَاحِ حَالٍ

ترجمہ: ''لوگوں کی ملاقات کچھ فائدہ نہیں دیتی، بجز قیل وقال کی بکواس کے، اس لئے لوگوں کی ملاقات کم کر بجز اس کے کہ علم حاصل کرنے کے واسطے استاذ سے یا اصلاحِ نفس کے واسطے کسی شیخ سے ملاقات ہو''

امام طَبرانی رحمۃ اللہ علیہ مشہور محدِث ہیں، بہت سی تصانیف فرمائی ہیں۔ کسی نے ان کی کثرتِ تصانیف کو دیکھ کر پوچھا کہ کس طرح لکھیں؟ کہنے لگے کہ تیس برس بوریئے پر گذار دیئے، یعنی رات دن بوریئے پر پڑے رہتے تھے۔ ابوالعباس شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے طبرانی رحمۃ اللہ علیہ سے تین لاکھ حدیثیں لکھی ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بڑی شدت کے ساتھ ناسخ اور منسوخ احادیث کی تحقیق فرماتے تھے۔ کوفہ جو اس زمانہ میں علم کا گھر کہلاتا تھا اس میں جتنے محدثین تھے سب کی احادیث کو جمع فرمایا تھا اور جب کوئی باہر سے محدِث آتے تو شاگردوں کو حکم فرماتے کہ ان کے پاس کوئی ایسی حدیث ہو جو اپنے پاس نہ ہو تو اسکی تحقیق کرو۔ ایک علمی مجلس امام صاحب کے یہاں تھی جس میں محدِّث، فقیہ، اہلِ لغت کا مجمع تھا۔ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو اس مجلس میں اس پر بحث ہوتی اور بعض مرتبہ ایک ایک مہینہ بحث رہتی۔ اس کے بعد جب کوئی بات طے ہوتی تو وہ مذہب قرار دی جاتی اور لکھ لی جاتی۔

امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے کون ناواقف ہوگا۔ احادیث کا کثرت سے یاد کرنا اور یادرکھنا ان کی خصوصی شان تھی اور قوتِ حافظہ میں ضربُ المثل تھے۔ بعض محدثین نے اُن کا امتحان لیا اور چالیس حدیثیں ایسی سنائیں جو غیر معروف تھیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً سنادیں۔ خود امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے مکّہ مکرمہ کے راستے میں ایک شیخ کی احادیث کے دو جزو نقل کئے تھے۔ اتفاق سے خود ان شیخ سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے درخواست کی کہ وہ دونوں جزو، احادیث کے استاذ سے سن بھی لوں، انہوں نے قبول کرلیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ جزو میرے پاس ہیں۔ مگر استاذ کی خدمت میں گیا تو بجائے ان کے دو سادے جزو ہاتھ میں تھے، استاذ نے سنانا شروع کیا۔ اتفاقاً ان کی نظر پڑی تو میرے ہاتھ میں سادے جزو تھے۔ ناراض ہوکر فرمایا۔ تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں نے قصّہ بیان کیا اور عرض کیا کہ آپ جو سناتے ہیں وہ مجھے یاد ہو جاتا ہے۔ استاذ کو یقین نہ آیا۔ فرمایا: اچھا سناؤ۔ میں نے سب حدیثیں سنادیں۔ فرمایا کہ یہ تم کو پہلے سے یاد ہوں گی، میں نے عرض کیا کہ اور نئی حدیثیں سنادیجئے۔ انہوں نے چالیس حدیثیں اور سنادیں۔ میں نے ان کو بھی فوراً سنادیا اور ایک بھی غلطی نہیں کی۔

محدثین نے جو جو محنتیں احادیث کے یاد کرنے میں، ان کو پھیلانے میں کی ہیں، ان کا اتّباع تو درکنار ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ قرطمہ رحمۃ اللہ علیہ ایک محدِث ہیں، زیادہ مشہور بھی نہیں ہیں۔ ان کے ایک شاگرد داؤد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ لوگ ابو حاتم رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کے حافظہ کا ذکر کرتے ہیں، میں نے قرطمہ رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ حافظ نہیں دیکھا۔ ایک مرتبہ میں ان کے پاس گیا۔ کہنے لگے کہ ان کتب میں سے جونسی دل چاہے اٹھالو، میں سنادوں گا۔ میں نے کتاب الاَشرِبہ اٹھائی، وہ ہر باب کے اخیر سے اول کی طرف پڑھتے گئے اور پوری کتاب سنا دی۔ ابوزُرعہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں۔ اسحٰق بن راہوَیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک لاکھ حدیثیں میں نے جمع کی ہیں اور تیس ہزار مجھے ازبر یاد ہیں۔ خفاف رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے گیارہ ہزار حدیثیں اپنی یاد سے ہمیں لکھوائیں اور پھر ان کو نمبروار سنایا، نہ کوئی حرف کم ہوا نہ زیادہ۔ ابوسعد اصبہانی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سولہ سال کی عمر میں ابونصر رحمۃ اللہ علیہ کی احادیث سننے کے لئے بغداد پہنچے۔ راستے میں ان کے انتقال کی خبر سن کر بے ساختہ رو پڑے۔ چیخیں نکل گئیں کہ ان کی سند کہاں ملے گی۔ اتنا رنج کہ رونے میں چیخیں نکل جائیں جب ہی ہوسکتا ہے جب کسی چیز کا عشق ہوجائے۔ ان کو مسلم شریف پوری حفظ یاد تھی اور حفظ ہی طلبہ کو لکھوایا کرتے تھے۔ گیارہ حج کئے۔ جب کھانا کھانے بیٹھتے تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ ابوعمر ضریر رحمۃ اللہ علیہ پیدائشی نابینا تھے، مگر حفاظِ حدیث میں شمار ہیں۔ علمِ فقہ، تاریخ، فرائض، حساب میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ ابوالحسین اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ کو بخاری شریف اور مسلم شریف دونوں یاد تھیں، بالخصوص بخاری شریف کا تو یہ حال تھا کہ جو کوئی سند پڑھتا اس کا متن یعنی حدیث پڑھ دیتے اور جو متن پڑھتا، اس کی سند پڑھ دیتے تھے۔

شیخ تقی الدین بَعْلَبَکّی رحمۃ اللہ علیہ نے چار مہینے میں مسلم شریف تمام حفظ کر لی تھی اور جمع بین الصحیحین کے بھی حافظ تھے۔ صاحبِ کرامات بزرگ تھے۔ قرآنِ پاک کے بھی حافظ تھے کہتے ہیں کہ سورۂ انعام ساری ایک دن میں حفظ کر لی تھی۔ ابن السُّنّی رحمۃ اللہ علیہ، امام نَسائی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور شاگرد ہیں۔ حدیث لکھنے میں اخیر تک مشغول رہے۔ ان کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میرے والد نے لکھتے لکھتے دوات میں قلم رکھا اور دونوں ہاتھ دعا

کے واسطے اٹھائے اور اسی حال میں انتقال ہو گیا۔ علامہ ساجی رحمۃ اللہ علیہ نے بچپن میں فقہ حاصل کیا۔ اس کے بعد علم حدیث کا شغل رہا۔ ہرات میں دس برس قیام کیا جس میں چھ مرتبہ ترمذی شریف اپنے ہاتھ سے لکھی۔ ابن مَندہ رحمۃ اللہ علیہ سے غرائب شُعبہ پڑھ رہے تھے کہ اسی حال میں ابن مَندہ رحمۃ اللہ علیہ کا عشاء کی نماز کے بعد انتقال ہوا۔ پڑھنے والے سے پڑھانے والے کا ولولۂ علمی قابلِ قدر ہے کہ اخیر وقت تک پڑھاتے رہے۔ ابوعَمر وخَفّاف رحمۃ اللہ علیہ کو ایک لاکھ حدیثیں از بر تھیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ عاصم بن علی رحمۃ اللہ علیہ جب بغداد پہنچے تو شاگردوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ اکثر ایک لاکھ سے زائد ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ اندازہ لگایا گیا تو ایک لاکھ بیس ہزار ہوئے۔ اسی وجہ سے بعض الفاظ کو کئی کئی مرتبہ کہنا پڑتا۔ ان کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ''حدثنا اللیث'' کو چودہ مرتبہ کہنا پڑا۔ ظاہر بات ہے کہ سوا لاکھ آدمیوں کو آواز پہنچانے کے واسطے بعض لفظوں کو کئی کئی مرتبہ کہنا ہی پڑے گا۔ ابو مسلم بصری رحمۃ اللہ علیہ جب بغداد پہنچے تو ایک بڑے میدان میں حدیث کا درس شروع ہوا، سات آدمی کھڑے ہو کر لکھواتے تھے جس طرح عید کی تکبیریں کہی جاتی ہیں۔ سبق کے بعد دواتیں شمار کی گئیں تو چالیس ہزار سے زیادہ تھیں اور جو لوگ صرف سننے والے تھے وہ ان سے علیحدہ۔ فِریابی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں اسی طرح لکھوانے والے تین سو سولہ تھے، اس سے مجمع کا اندازہ اپنے آپ ہو جاتا ہے۔ اس محنت اور مشقت سے یہ پاک علم آج تک زندہ ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے بخاری شریف لکھی ہے جس میں سات ہزار دو سو پچھتر حدیثیں ہیں اور ہر حدیث لکھتے وقت دو رکعت نفل نماز پڑھ کر حدیث لکھی ہے۔ جب یہ بغداد پہنچے تو وہاں کے محدثین نے ان کا امتحان لیا، اس طرح کہ دس آدمی متعیّن ہوئے، ان میں سے ہر شخص نے دس دس حدیثیں چھانٹیں، ان کو بدل بدل کر ان سے پوچھا۔ یہ ہر سوال کے جواب میں ''مجھے معلوم نہیں'' کہتے رہے۔ جب دس کے دس پوچھ چکے تو انہوں نے سب سے پہلے پوچھنے والے کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے سب سے پہلی حدیث یہ پوچھی تھی، تم نے اس طرح بیان کی، یہ غلط ہے، اور صحیح اس طرح ہے۔ دوسری حدیث یہ پوچھی تھی، وہ اس طرح تم نے بیان کی، یہ غلط ہے اور صحیح اس طرح ہے۔ غرض اسی طرح سو کی سو حدیثیں ترتیب وار بیان فرما دیں کہ ہر حدیث

کو اوّل اس طرح پڑھتے جس طرح امتحان لینے والے نے پڑھا تھا، پھر کہتے کہ یہ غلط ہے اور صحیح اس طرح ہے۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے چودہ برس کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کی، اسی میں اخیر تک مشغول رہے۔ خود کہتے ہیں کہ میں نے تین لاکھ احادیث میں سے چھانٹ کر مسلم شریف تصنیف کی ہے جس میں بارہ ہزار حدیثیں ہیں۔ امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے پانچ لاکھ احادیث سنی ہیں جن میں سے انتخاب کر کے سُنَن ابوداؤد شریف تصنیف کی ہے جس میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں ہیں۔ یوسف مِزِّی مشہور محدِث ہیں، اسماءِ رجال کے امام ہیں۔ اول اپنے شہر میں فقہ اور حدیث حاصل کیا۔ اس کے بعد مکّہ مکرمہ، مدینہ منورہ، حلَب، حمات، بَعْلَبَک وغیرہ کا سفر کیا۔ بہت سی کتابیں اپنے قلم سے لکھیں۔ تہذیبُ الکمال دو سو جلدوں میں تصنیف کی اور کتاب الاطراف اسّی ۸۰ جلدوں سے زیادہ میں۔ ان کی عادتِ شریفہ تھی کہ اکثر چپ رہتے، بات کسی سے بہت ہی کم کرتے تھے۔ اکثر اوقات کتاب کو دیکھنے میں مشغول رہتے تھے۔ حاسدوں کی عداوت کا شکار بھی بنے، مگر انتقام نہیں لیا۔ ان حضرات کے حالات کا احاطہ دشوار ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان کے حالات اور جانفشانیوں کا احاطہ نہیں کر سکیں۔ یہاں نمونہ کے طور پر چند حضرات کے دو چار واقعات کا ذکر اس لئے کیا، تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہ علمِ حدیث جو آج ساڑھے تیرہ سو برس تک نہایت آب و تاب سے باقی ہے وہ کس محنت اور جانفشانی سے باقی رکھا گیا ہے اور جو لوگ علم حاصل کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں، اپنے آپ کو طالب علم کہتے ہیں وہ کتنی محنت اور مشقت اس کے لئے گوارا کرتے ہیں۔ اگر ہم لوگ یہ چاہیں کہ ہم اپنی عیش و عشرت، راحت و آرام، سیر و تفریح اور دنیا کے دوسرے مشاغل میں لگے رہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک کلام کا یہ شُیوع اسی طرح باقی رہے تو ''ایں خیال است و محال است و جنوں'' کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

نواں باب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری اور امتثالِ حکم

اور یہ دیکھنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء مبارک کیا ہے۔ ویسے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہر فعل فرمانبرداری تھا اور گذشتہ قصوں سے بھی یہ بات خوب روشن ہے، لیکن خاص طور سے چند قصّے

اس باب میں اس لئے ذکر کئے جاتے ہیں کہ ہم لوگ اپنی حالتوں کا اس باب سے خاص طور پر مقابلہ کر کے دیکھیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی فرمانبرداری کہاں تک کرتے ہیں جس پر ہم لوگ ہر وقت اس کے بھی منتظر رہتے ہیں کہ وہ برکات و ترقیات اور ثمرات جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوتے تھے ہمیں بھی حاصل ہوں، اگر واقعی ہم لوگ اس چیز کے مُتمنّی ہیں تو ہمیں بھی وہ کرنا چاہئے جو وہ حضرات کر کے دکھلا گئے ہیں۔

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کا چادر کو جلا دینا

حضرت عبداللہ بن عَمرِو بنِ العَاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ سفر میں ہم لوگ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میرے اوپر ایک چادر تھی جو کُسم کے رنگ میں ہلکی سی رنگی ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا: یہ کیا اوڑھ رکھا ہے؟ مجھے اس سوال سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ناگواری کے آثار معلوم ہوئے۔ میں گھر والوں کے پاس واپس ہوا تو انہوں نے چولہا جلا رکھا تھا۔ میں نے وہ چادر اس میں ڈال دی۔ دوسرے روز جب حاضری ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ چادر کیا ہوئی؟ میں نے قصّہ سنا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ عورتوں میں سے کسی کو کیوں نہ پہنا دی؟ عورتوں کے پہننے میں تو مضائقہ نہ تھا۔[۱]

ف: اگرچہ چادر کے جلانے کی ضرورت نہ تھی، مگر جس کے دل میں کسی کی ناگواری اور ناراضی کی چوٹ لگی ہوئی ہو، وہ اتنی سوچ کا متحمل ہی نہیں ہوتا کہ اس کی کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ ہاں! مجھ جیسا نالائق ہوتا، تو نا معلوم کتنے احتمالات پیدا کر لیتا کہ یہ ناگواری کس درجہ کی ہے اور دریافت تو کر لوں اور کوئی صورت اجازت کی بھی ہو سکتی ہے یا نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ہی تو ہے، منع تو نہیں کیا وغیرہ وغیرہ۔

(۲) انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان کو ڈھا دینا

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ دولت کدہ سے باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک قُبّہ (گنبد دار حجرہ) دیکھا جو اونچا بنا ہوا تھا۔ ساتھیوں سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا

[۱] ابوداؤد

ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ فلاں انصاری نے قُبّہ بنایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سن کر خاموش ہورہے۔ کسی دوسرے وقت وہ انصاری حاضرِ خدمت ہوئے اور سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعراض فرمایا، سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ انہوں نے اس خیال سے کہ شاید خیال نہ ہوا ہو، دوبارہ سلام کیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر بھی اعراض فرمایا اور جواب نہیں دیا۔ وہ اس کے کیسے متحمل ہوسکتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو وہاں موجود تھے دریافت کیا، پوچھا، تحقیق کی کہ میں آج حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں کو پھرا ہوا پاتا ہوں، خیر تو ہے؟ انہوں نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لے گئے تھے۔ راستہ میں تمہارا قُبّہ دیکھا تھا اور دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا ہے؟ یہ سن کر وہ انصاری فوراً گئے اور اس کو توڑ کر ایسا زمین کے برابر کردیا کہ نام ونشان بھی نہ رہا اور پھر آکر عرض بھی نہیں کیا۔ اتفاقاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا اس جگہ کسی دوسرے موقع پر گذر ہوا تو دیکھا کہ وہ قبہ وہاں نہیں ہے۔ دریافت فرمایا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ انصاری نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض کا کئی روز ہوئے ذکر کیا تھا، ہم نے کہہ دیا تھا کہ تمہارا قبہ دیکھا ہے۔ انہوں نے آکر اس کو بالکل توڑ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر تعمیر آدمی پر وبال ہے، مگر وہ تعمیر جو سخت ضرورت اور مجبوری کی ہو۔[۱]

ف: یہ کمالِ عشق کی باتیں ہیں، ان حضرات کو اس کا تحمّل ہی نہیں تھا کہ چہرۂ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رنجیدہ دیکھیں یا کوئی شخص اپنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گرانی کو محسوس کرے۔ ان صحابی نے قُبّہ کو گرایا اور پھر یہ بھی نہیں کہ گرانے کے بعد جتانے کے طور پر آکر کہتے کہ آپ کی خوشی کے واسطے گرادیا، بلکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ہی اتفاق سے ادھر کو تشریف لے جانا ہوا تو ملاحظہ فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تعمیر میں روپے کا ضائع کرنا خاص طور سے ناگوار تھا۔ بہت سی احادیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔ خود ازواجِ مطہرات کے مکانات کھجور کی ٹہنیوں کے ٹٹے تھے جن پر ٹاٹ کے پردے پڑے رہتے تھے، تاکہ اجنبی نگاہ اندر نہ جاسکے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں سفر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو کچھ ثروت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے مکان پر بجائے ٹٹوں[۲] کے کچی اینٹیں لگالیں۔ واپسی پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا کہ یہ کیا کیا؟ انہوں نے عرض کیا کہ اس میں بے پردگی کا

[۱] ابوداؤد، [۲] ٹٹا: بانس یا پرکنڈوں کا بنا ہوا چھپرا جو دروازوں یا کھڑکیوں وغیرہ پر لگاتے ہیں۔

احتمال رہتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدترین چیز جس میں آدمی کا روپیہ خرچ ہو تعمیر ہے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اور میری والدہ اپنے مکان کی ایک دیوار کو جو خراب ہوگئی تھی درست کررہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ملاحظہ فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ موت اس دیوار کے گرنے سے زیادہ قریب ہے۔[۱]

(۳) صحابہ رضی اللہ عنہم کا سرخ چادروں کو اُتارنا

حضرت رافع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مرتبہ سفر میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے اور ہمارے اونٹوں پر چادریں پڑی ہوئی تھیں جن میں سرخ ڈورے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں دیکھتا ہوں کہ یہ سرخی تم پر غالب ہوتی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فرمانا تھا کہ ہم لوگ ایک دَم ایسے گھبرا کے اٹھے کہ ہمارے بھاگنے سے اونٹ بھی ادھر ادھر بھاگنے لگے اور ہم نے فوراً سب چادریں اونٹوں سے اتار لیں۔[۲]

ف: صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگی میں اس قسم کے واقعات کوئی اہمیّت نہیں رکھتے۔ ہاں! ہماری زندگی کے اعتبار سے ان پر تعجب ہوتا ہے۔ ان حضرات کی عام زندگی ایسی ہی تھی۔ عُروہ بن مسعود جب صلحِ حدیبیہ میں (جس کا قصّہ باب نمبر۱ کے عنوان نمبر۳ پر گذرا) کفّار کی طرف سے قاصد کی حیثیت سے آئے تھے تو مسلمانوں کی حالت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا اور مکّہ واپس جا کر کُفّار سے کہا تھا کہ میں بڑے بڑے بادشاہوں کے یہاں قاصد بن کر گیا ہوں۔ فارس، روم اور حبشہ کے بادشاہوں سے ملا ہوں۔ میں نے کسی بادشاہ کے یہاں یہ بات نہیں دیکھی کہ اس کے درباری اس کی اس قدر تعظیم کرتے ہوں جتنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت ان کی تعظیم کرتی ہے۔ کبھی ان کا بلغم زمین پر گرنے نہیں دیتی، وہ کسی نہ کسی کے ہاتھ پر پڑتا ہے اور وہ اس کو منہ اور بدن پر مل لیتا ہے۔ جب وہ کوئی حکم کرتے ہیں تو ہر شخص دوڑتا ہے کہ تعمیل کرے۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی بدن پر ملنے اور لینے کے واسطے ایسے دوڑتے ہیں گویا آپس میں جنگ وجدَل ہوجاوے گا اور جب وہ بات کرتے ہیں تو سب چپ ہوجاتے ہیں۔ کوئی شخص ان کی طرف عظمت کی وجہ سے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔[۳]

---

۱ ابوداؤد، ۲ ابوداؤد، ۳ بخاری

(۴) حضرت وائل رضی اللہ عنہ کا ذُباب کے لفظ سے بال کٹوا دینا

وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حاضرِ خدمت ہوا۔ میرے سر کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ میں سامنے آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ذُبَابٌ ذُبَابٌ"۔ میں یہ سمجھا کہ میرے بالوں کو ارشاد فرمایا: میں واپس گیا اور ان کو کٹوا دیا۔ جب دوسرے دن خدمت میں حاضری ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہیں نہیں کہا تھا، لیکن یہ اچھا کیا۔[۱]

ف: ذُباب کے معنی منحوس کے بھی ہیں اور بری چیز کے بھی ۔ یہ اشاروں پر مر مٹنے کی بات ہے کہ منشا سمجھنے کے بعد خواہ غلط ہی سمجھا ہو اس کی تعمیل میں دیر نہ ہوتی تھی۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد ہی فرما دیا کہ تم کو نہیں کہا تھا، مگر یہ چونکہ اپنے متعلق سمجھے اس لئے کیا مجال تھی کہ دیر ہوتی ۔ ابتدائے اسلام میں نماز میں بولنا جائز تھا پھر منسوخ ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے حسبِ معمول سلام کیا، چونکہ نماز میں بولنا منسوخ ہو چکا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہ دیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب نہ دینے سے نئی اور پرانی باتیں یاد آ کر مختلف خیالات نے مجھے آ گھیرا۔ کبھی سوچتا فلاں بات سے ناراضی ہوئی۔ کبھی خیال کرتا کہ فلاں بات پیش آئی۔ آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلام پھیرا اور ارشاد فرمایا کہ نماز میں کلام کرنا منسوخ ہو گیا ہے، اس لئے میں نے سلام کا جواب نہیں دیا تھا، تب جان میں جان آئی۔

(۵) حضرت سہیل بن حَنظَلیہ رضی اللہ عنہ کی عادت اور خُریم رضی اللہ عنہ کا بال کٹوا دینا

دمشق میں سہیل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی رہا کرتے تھے جو نہایت یکسو تھے۔ بہت کم کسی سے ملتے جلتے تھے اور کہیں آتے جاتے نہ تھے۔ دن بھر نماز میں مشغول رہتے یا تسبیح اور وظائف میں، مسجد میں آتے جاتے۔ راستہ میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ پر جو مشہور صحابی ہیں گذر ہوتا۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے کہ کوئی کلمۂ خیر سناتے جاؤ، تمہیں کوئی نقصان نہیں، ہمیں نفع ہو جائے گا۔ تو وہ کوئی واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا یا کوئی حدیث سنا دیتے۔

---

[۱] ابوداؤد

ایک مرتبہ اسی طرح جا رہے تھے۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے معمول کے موافق درخواست کی کہ کوئی کلمۂ خیر سناتے جائیں۔ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خُریم اسدی اچھا آدمی ہے اگر دو باتیں نہ ہوں: ایک سر کے بال بہت بڑے رہتے ہیں، دوسرے لنگی ٹخنوں سے نیچی باندھتا ہے۔ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پہنچا، فوراً چاقو لے کر بال کانوں کے نیچے سے کاٹ دیئے اور لنگی آدھی پنڈلی تک باندھنا شروع کر دی۔[1]

ف: بعض روایات میں آیا ہے کہ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان دونوں باتوں کو ارشاد فرمایا اور انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ اب سے نہ ہوں گی۔ مگر دونوں روایتوں میں کچھ اِشکال نہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کہ خود ان سے بھی ارشاد فرمایا ہو اور غیبت میں بھی ارشاد فرمایا ہو جو سننے والے نے ان سے جا کر عرض کر دیا۔

(۶) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا اپنے بیٹے سے نہ بولنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ عورتوں کو مسجد میں جانے کی اجازت دے دیا کرو۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک صاحبزادہ نے عرض کیا کہ ہم تو اجازت نہیں دے سکتے، کیونکہ وہ اس کو آئندہ چل کر بہانہ بنا لیں گی آزادی اور فساد و آوارگی کا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما بہت ناراض ہوئے، برا بھلا کہا اور فرمایا کہ میں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سناؤں اور تو کہے کہ اجازت نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد سے ہمیشہ کے لئے ان صاحبزادہ سے بولنا چھوڑ دیا۔[2]

ف: صاحبزادہ کا یہ کہنا کہ فساد کا حیلہ بنا لیں گی، اپنے زمانہ کی حالت کو دیکھ کر تھا۔ اسی وجہ سے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس زمانہ کی عورتوں کا حال دیکھتے تو ضرور عورتوں کو مسجد میں جانے سے منع فرما دیتے، حالانکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا زمانہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ زیادہ بعد کا نہیں، لیکن اس کے باوجود حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو اس کا تحمّل نہیں ہوسکا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو سن کر اس میں کوئی تردّد یا تامُّل کیا جائے اور

---

[1] ابوداؤد، [2] مسلم، ابوداؤد

صرف اس بات پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر انہوں نے انکار کیا، عمر بھر نہیں بولے۔ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی اس میں دقّتیں اٹھانا پڑیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک ارشاد کی اہمیّت کی وجہ سے جوان کی جان تھی، مسجد سے روکنا بھی مشکل تھا اور زمانہ کے فساد کی وجہ سے جس کا اندیشہ اسی وقت سے شروع ہو گیا تھا، اجازت بھی مشکل تھی، چنانچہ حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہا جن کے کئی نکاح ہوئے جن میں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ہوا وہ مسجد میں تشریف لے جاتی تھیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو گراں ہوتا تھا۔ کسی نے ان کو کہا کہ عمر رضی اللہ عنہ کو گراں ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر ان کو گراں ہے تو منع کر دیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ ان کو بھی یہ چیز گراں تھی، مگر روکنے کی ہمت نہ ہوئی تو ایک مرتبہ عشاء کی نماز کے لئے یہ جہاں کو جاتی تھیں، راستہ میں بیٹھ گئے اور جب یہ پاس کو گذریں تو ان کو چھیڑا، خاوند تھے اس لئے ان کو تو جائز تھا ہی مگر ان کو خبر نہ ہوئی اندھیرا تھا کہ یہ کون ہیں۔ اس کے بعد سے انہوں نے جانا چھوڑ دیا۔ دوسرے وقت حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ مسجد میں کیوں جانا چھوڑ دیا۔ کہنے لگیں کہ اب زمانہ نہیں رہا۔

(۷) حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے سوال کہ نمازِ قصر قرآن میں نہیں

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے پوچھا کہ قرآن شریف میں مُقیم کی نماز کا بھی ذکر ہے اور خوف کی نماز کا بھی، مسافر کی نماز کا ذکر نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ برادرزادہ! اللہ جل شانہٗ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنا کر بھیجا۔ ہم لوگ انجان تھے، کچھ نہیں جانتے تھے۔ بس جو ہم نے ان کو کرتے دیکھا وہ کریں گے۔[۱]

ف: مقصود یہ ہے کہ ہر مسئلہ کا صراحۃً قرآن شریف میں ہونا ضروری نہیں، عمل کے واسطے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو جانا کافی ہے۔ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے قرآن شریف عطا ہوا اور اس کے برابر اور احکام دیئے گئے۔ عنقریب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ پیٹ بھرے لوگ اپنے گدوں پر بیٹھ کر کہیں گے کہ بس قرآن شریف کو مضبوط پکڑ لو جو اس میں احکام ہیں ان پر عمل کرو۔[۲] فائدہ: پیٹ بھرے سے مراد یہ ہے کہ اس قسم کے فاسد

---
[۱] شفاء، [۲] ابوداؤد

خیال دولت کے نشہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

(۸) حضرت ابن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ کا خَذَف کی وجہ سے کلام چھوڑ دینا

عبداللہ بن مُغَفَّل رضی اللہ عنہ کا ایک نوعمر بھتیجا خذف سے کھیل رہا تھا۔ انہوں نے دیکھا اور فرمایا کہ برادر زادہ! ایسا نہ کرو۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس سے فائدہ کچھ نہیں، نہ شکار ہوسکتا ہے اور نہ دشمن کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور اتفاقاً کسی کے لگ جائے تو آنکھ پھوٹ جائے، دانت ٹوٹ جائے۔ بھتیجا کم عمر تھا، اس نے جب چچا کو غافل دیکھا تو پھر کھیلنے لگا۔ انہوں نے دیکھ لیا، فرمایا کہ میں تجھے حضور ﷺ کا ارشاد سناتا ہوں۔ تُو پھر اسی کام کو کرتا ہے۔ خدا کی قسم! تجھ سے کبھی بات نہیں کروں گا۔ ایک دوسرے قصہ میں اس کے بعد ہے: خدا کی قسم! نہ تیرے جنازہ میں شریک ہوں گا، نہ تیری عیادت کروں گا۔[1]

ف: خَذَف اس کو کہتے ہیں کہ انگوٹھے پر چھوٹی سی کنکری رکھ کر اس کو انگلی سے پھینک دیا جائے۔ بچوں میں عام طور سے اس طرح کھیلنے کا مرض ہوتا ہے وہ ایسا تو ہوتا نہیں کہ اس سے شکار ہو سکے۔ ہاں آنکھ میں کسی کے اتفاقاً لگ جائے تو اس کو زخمی کر ہی دے۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کو اس کا تحمّل نہ ہوسکا کہ حضور ﷺ کا ارشاد سنانے کے بعد بھی وہ بچہ اس کام کو کرے۔ ہم لوگ صبح سے شام تک حضور ﷺ کے کتنے ارشادات سنتے ہیں اور ان کا کتنا اہتمام کرتے ہیں۔ ہر شخص خود ہی اپنے متعلق فیصلہ کرسکتا ہے۔

(۹) حضرت حکیم بن حِزام رضی اللہ عنہ کا سوال نہ کرنے کا عہد

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، کچھ طلب کیا۔ حضور ﷺ نے عطا فرمایا، پھر کسی موقع پر کچھ مانگا۔ حضور ﷺ نے پھر مرحمت فرما دیا۔ تیسری دفعہ پھر سوال کیا۔ حضور ﷺ نے عطا فرمایا اور یہ ارشاد فرمایا کہ حکیم! یہ مال سبز باغ ہے، ظاہر میں بڑی میٹھی چیز ہے، مگر اس کا دستور یہ ہے کہ اگر یہ دل کے استغنا سے ملے تو اس میں برکت ہوتی ہے اور اگر طمع اور لالچ سے حاصل ہو تو اس میں برکت نہیں ہوتی، ایسا

---

[1] ابوداؤد، [2] ابن ماجہ، دارمی

ہو جاتا ہے (جیسے جوع البقر کی بیماری ہو) کہ ہر وقت کھائے جائے اور پیٹ نہ بھرے۔ حکیم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کے بعد اب کسی کو نہیں ستاؤں گا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں حکیم رضی اللہ عنہ کو بیت المال سے کچھ عطا فرمانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بار بار اصرار کیا، مگر انہوں نے انکار ہی فرما دیا۔[1]

ف: یہی وجہ ہے کہ آج کل ہم لوگوں کے مالوں میں برکت نہیں ہوتی کہ لالچ اور طمع میں گھرے رہتے ہیں۔

(۱۰) حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا جاسوسی کے لئے جانا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں ہماری ایک طرف تو مکّہ کے کُفّار اور ان کے ساتھ دوسرے کافروں کے بہت سے گروہ تھے جو ہم پر چڑھائی کر کے آئے تھے اور حملہ کے لئے تیار تھے، اور دوسری طرف خود مدینہ منورہ میں بنو قُریظہ کے یہود ہماری دشمنی پر تلے ہوئے تھے جن سے ہر وقت اندیشہ تھا کہ کہیں مدینہ منورہ کو خالی دیکھ کر وہ ہمارے اہل وعیال کو بالکل ختم نہ کر دیں۔ ہم لوگ مدینہ منورہ سے باہر لڑائی کے سلسلہ میں پڑے ہوئے تھے۔ منافقوں کی جماعت گھر کے خالی اور تنہا ہونے کا بہانہ کر کے اجازت لے کر اپنے گھروں کو واپس جا رہی تھی اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر اجازت مانگنے والے کو اجازت مرحمت فرما دیتے تھے۔ اسی دوران میں ایک رات آندھی اس قدر شدت سے آئی کہ نہ اس سے پہلے کبھی اتنی آئی اور نہ اس کے بعد۔ اندھیرا اس قدر زیادہ کہ آدمی کو پاس والا آدمی تو کیا، اپنا ہاتھ بھی نظر نہیں آتا تھا، اور ہوا اتنی سخت کہ اس کا شور بجلی کی طرح گرج رہا تھا۔ منافقین اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہم تین سو کا مجمع اس جگہ تھا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کا حال دریافت فرما رہے تھے اور اسی اندھیری میں ہر طرف تحقیقات فرما رہے تھے۔ اتنے میں میرے پاس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہوا۔ میرے پاس نہ تو دشمن سے بچاؤ کے واسطے کوئی ہتھیار، نہ سردی سے بچاؤ کے لئے کوئی کپڑا، صرف ایک چھوٹی سی چادر تھی جو اوڑھنے میں

---

[1] بخاری

گھٹنوں تک آتی تھی اور وہ بھی میری نہیں، بیوی کی تھی۔ میں اس کو اوڑھے ہوئے گھٹنوں کے بَل زمین سے چمٹا ہوا بیٹھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کون ہے؟ میں نے عرض کیا: حذیفہ۔ مگر مجھ سے سردی کے مارے اٹھا بھی نہ گیا اور شرم کے مارے زمین سے چمٹ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اٹھ کھڑا ہو اور دشمنوں کے جتھے میں جا کر ان کی خبر لا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں اس وقت گھبراہٹ، خوف اور سردی کی وجہ سے سب سے زیادہ خستہ حال تھا، مگر تعمیلِ ارشاد میں اٹھ کر فوراً چل دیا۔ جب میں جانے لگا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی۔ "اَللّٰهُمَّ احْفَظْهُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِنْ خَلْفِهٖ وَ عَنْ يَّمِيْنِهٖ وَ عَنْ شِمَالِهٖ وَ مِنْ فَوْقِهٖ وَمِنْ تَحْتِهٖ" "یا اللہ! آپ اس کی حفاظت فرمائیں سامنے سے اور پیچھے سے، دائیں سے اور بائیں سے، اوپر سے اور نیچے سے"۔

حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فرمانا تھا کہ گویا مجھ سے خوف اور سردی بالکل ہی جاتی رہی اور ہر ہر قدم پر یہ معلوم ہوتا تھا گویا گرمی میں چل رہا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چلتے وقت یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ کوئی حرکت نہ کر کے آئیو۔ چپ چاپ دیکھ کر آ جاؤ کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ آگ جل رہی ہے اور لوگ سینک رہے ہیں۔ ایک شخص آگ پر ہاتھ سینکتا ہے اور کوکھ پر پھیر لیتا ہے اور ہر طرف سے "واپس چل دو، واپس چل دو" کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ہر شخص اپنے قبیلہ والوں کو آواز دے کر کہتا ہے کہ واپس چلو اور ہوا کی تیزی کی وجہ سے چاروں طرف سے پتھر ان کے خیموں پر برس رہے تھے۔ خیموں کی رسیاں ٹوٹتی جاتی تھیں اور گھوڑے وغیرہ جانور ہلاک ہو رہے تھے۔ ابوسفیان جو ساری جماعتوں کا اس وقت گویا سردار بن رہا تھا آگ پر سینک رہا تھا۔ میرے دل میں آیا کہ موقع اچھا ہے اس کو نمٹاتا چلوں۔ ترکش میں سے تیر نکال کر کمان میں بھی رکھ لیا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد آیا کہ کوئی حرکت نہ کیجیو، دیکھ کر چلے آنا۔ اس لئے میں نے تیر کو ترکش میں رکھ دیا۔ ان کو شبہ ہو گیا، کہنے لگے: تم میں سے کوئی جاسوس ہے، ہر شخص اپنے برابر والے کا ہاتھ پکڑ لے۔ میں نے جلدی سے ایک آدمی کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا، تو کون؟ وہ کہنے لگا: سبحان اللہ! تو مجھے نہیں جانتا میں فلاں ہوں۔ میں وہاں سے واپس آیا۔ جب آدھے راستہ

پر تھا تو تقریباً بیس سوار عمامہ باندھے ہوئے مجھے ملے۔ انہوں نے کہا: اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اللہ نے دشمنوں کا انتظام کر دیا، بے فکر رہیں۔ میں واپس پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چھوٹی سی چادر اوڑھے نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ ہمیشہ کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب کوئی گھبراہٹ کی بات پیش آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی طرف متوجہ ہو جایا کرتے تھے۔ نماز سے فراغت پر میں نے وہاں کا جو منظر دیکھا تھا عرض کر دیا۔ جاسوس کا قصّہ سن کر دندان مبارک چمکنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے پاؤں مبارک کے قریب لٹالیا اور اپنی چادر کا ذرا سا حصّہ مجھ پر ڈال دیا۔ میں نے اپنے سینے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تلووں سے چمٹالیا۔[1]

ف: ان ہی حضرات کا یہ حصّہ تھا اور ان ہی کو زیبا تھا کہ اس قدر سختیوں اور دِقتوں کی حالت میں بھی تعمیلِ ارشاد تن من، جان مال، سب سے زیادہ عزیز تھی۔ اللہ جَلَّ شانُہٗ بلا استحقاق اور بلا اہلیت مجھ ناپاک کو بھی ان کے اتّباع کا کوئی حصّہ نصیب فرمادیں تو زہے قسمت۔

دسواں باب

عورتوں کا دینی جذبہ

حقیقت یہ ہے کہ اگر عورتوں میں دین کا شوق اور نیک اعمال کا جذبہ پیدا ہو جائے تو اولاد پر اس کا اثر ضروری ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے زمانہ میں اولاد کو شروع ہی سے ایسے ماحول میں رکھا جاتا ہے جس میں اس پر دین کے خلاف اثر پڑے یا کم از کم یہ کہ دین کی طرف سے بے توجہی پیدا ہو جائے۔ جب ایسے ماحول میں ابتدائی زندگی گذرے گی تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے وہ ظاہر ہیں۔

(۱) تسبیحاتِ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک شاگرد سے فرمایا کہ میں تمہیں اپنا اور فاطمہ کا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ لاڈلی بیٹی تھیں قصّہ سناؤں؟ شاگرد نے کہا: ضرور۔ فرمایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے چکی پیستی تھیں جس کی وجہ سے ہاتھ میں نشان پڑ گئے تھے اور خود پانی کی

---

[1] درمنثور

مَشک بھر کر لاتی تھیں جس کی وجہ سے سینہ پر مَشک کی رسی کے نشان پڑ گئے تھے اور گھر کی جھاڑو وغیرہ بھی خود ہی دیتی تھیں جس کی وجہ سے تمام کپڑے میلے کچیلے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غلام باندیاں آئیں۔ میں نے فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ تم بھی جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک خدمت گار مانگ لو تاکہ تم کو کچھ مدد مل جاوے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں، وہاں مجمع تھا اور شرم مزاج میں بہت زیادہ تھی، اس لئے شرم کی وجہ سے سب کے سامنے باپ سے بھی مانگتے ہوئے شرم آئی۔ واپس آ گئیں۔ دوسرے دن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لائے، ارشاد فرمایا کہ فاطمہ! کل تم کس کام کے لئے گئی تھیں؟ وہ شرم کی وجہ سے چپ ہو گئیں۔ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ان کی یہ حالت ہے کہ چکّی کی وجہ سے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے اور مَشک کی وجہ سے سینہ پر رسی کے نشان ہو گئے، ہر وقت کے کاروبار کی وجہ سے کپڑے میلے رہتے ہیں۔ میں نے ان سے کل کہا تھا کہ آپ کے پاس خادم آئے ہوئے ہیں، ایک یہ بھی مانگ لیں، اس لئے گئی تھیں۔
بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے اور علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ہی بستر ہے اور وہ بھی مینڈھے کی ایک کھال ہے۔ رات کو اس کو بچھا کر سو جاتے ہیں، صبح کو اسی پر گھاس دانہ ڈال کر اونٹ کو کھلاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بیٹی صبر کر۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی بیوی کے پاس دس برس تک ایک ہی بچھونا (بستر) تھا، وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چوغہ تھا، رات کو اسی کو بچھا کر سو جاتے تھے۔ تو تقویٰ حاصل کر اور اللہ سے ڈر اور اپنے پروردگار کا فریضہ ادا کرتی رہ اور گھر کے کاروبار کو انجام دیتی رہ اور جب سونے کے واسطے لیٹا کرے تو سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ، الحمد للہ ۳۳ مرتبہ اور اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ پڑھ لیا کرو۔ یہ خادم سے زیادہ اچھی چیز ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: میں اللہ اور اس کے رسول سے راضی ہوں۔[1]

ف: یعنی جو اللہ اور اس کے رسول کی رضا میرے بارے میں ہو مجھے بخوشی منظور ہے۔ یہ تھی زندگی دو جہاں کے بادشاہ کی بیٹی کی۔ آج ہم لوگوں میں سے کسی کے پاس دو پیسہ ہو جائیں تو اس کے گھر والے گھر کا کام کاج تو درکنار اپنا کام بھی نہ کر سکیں۔ پاخانہ میں لوٹا بھی ماما ہی رکھ کر آئے۔ اس واقعہ میں جو اوپر ذکر کیا گیا صرف سونے کے وقت کا ذکر ہے،

---
[1] ابوداؤد

دوسری حدیثوں میں ہر نماز کے بعد ٣٣ مرتبہ یہ تینوں کلمے اور ایک مرتبہ "لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰـهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" بھی آیا ہے۔

(٢) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا صدقہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں دو گونین[١] درہموں کی بھر کر پیش کی گئیں جن میں ایک لاکھ سے زیادہ درہم تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے طَباق منگایا اور ان کو بھر بھر کر تقسیم فرمانا شروع کر دیا اور شام تک سب ختم کر دیئے، ایک درہم بھی باقی نہ چھوڑا خود روزہ دار تھیں، افطار کے وقت باندی سے کہا کہ افطار کے لئے کچھ لے آؤ۔ وہ ایک روٹی اور زیتون کا تیل لے آئیں اور عرض کرنے لگیں: کیا اچھا ہوتا کہ ایک درہم کا گوشت ہی منگا لیتیں، آج ہم روزہ گوشت سے افطار کر لیتے۔ فرمانے لگیں: اب طعن دینے سے کیا ہوتا ہے۔ اس وقت یاد دلاتی تو میں منگا لیتی۔[٢]

ف: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں اس نوع کے نذرانہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما وغیرہ حضرات کی طرف سے پیش کئے جاتے تھے، کیونکہ وہ زمانہ فتوحات کی کثرت کا تھا۔ مکانوں میں غلّہ کی طرح سے اشرفیوں کے اَنبار پڑے رہتے تھے اور اس کے باوجود اپنی زندگی نہایت سادہ اور نہایت معمولی گذاری جاتی تھی، حتیٰ کہ افطار کے واسطے بھی ماما[٣] کے یاد دلانے کی ضرورت تھی۔ پچیس ہزار روپے کے قریب تقسیم کر دیا اور یہ خیال بھی نہ آیا کہ میرا روزہ ہے اور گوشت بھی منگانا ہے۔ آج کل اس قسم کے واقعات اتنے دور ہو گئے ہیں کہ خود واقعہ کے سچّا ہونے میں تَردُّد ہونے لگا، لیکن اس زمانہ کی عام زندگی جن لوگوں کی نظر میں ہے، ان کے نزدیک یہ اور اس قسم کے سینکڑوں واقعات کچھ بھی تعجب کی چیز نہیں۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بہت سے واقعات اس کے قریب قریب ہیں۔ ایک دفعہ روزہ دار تھیں اور گھر میں ایک روٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک فقیر نے آ کر سوال کیا۔ خادمہ سے فرمایا کہ وہ روٹی اس کو دیدو، اس نے عرض کیا کہ افطار کے لئے گھر میں کچھ بھی نہیں۔ فرمایا: کیا مضائقہ ہے؟ وہ روٹی اس کو دے دو اس نے دیدی۔[٤] ایک مرتبہ ایک

---

[١] پانی یا غلّہ رکھنے کے دو بڑے مٹی کے برتن، [٢] تذکرہ ، [٣] خادمہ [٤] موطأ

سانپ مار دیا۔ خواب میں دیکھا کوئی کہتا ہے کہ تم نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ فرمایا: اگر وہ مسلمان ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے یہاں نہ آتا۔ اس نے کہا: مگر پردے کی حالت میں آیا تھا۔ اس پر گھبرا کر آنکھ کھل گئی اور بارہ ہزار درہم جو ایک آدمی کا خون بہا ہوتے ہیں صدقہ کئے۔ عُروَہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ دیکھا کہ ستر ہزار درہم صدقہ کئے اور اپنے کرتہ میں پیوند لگ رہا تھا۔[1]

(۳) حضرت اِبنِ زبیر رضی اللہ عنہما کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو صدقہ سے روکنا

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے اور وہ ان سے بہت محبّت فرماتی تھیں، انہوں نے ہی گویا بھانجے کو پالا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس فیاضی سے پریشان ہو کر کہ خود تکلیفیں اٹھائیں اور جو آئے وہ فوراً خرچ کر دیں، ایک دفعہ کہہ دیا کہ خالہ کا ہاتھ کسی طرح روکنا چاہئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی یہ فقرہ پہنچ گیا، اس پر ناراض ہو گئیں کہ میرا ہاتھ روکنا چاہتا ہے اور ان سے نہ بولنے کی نذر کے طور پر قسم کھائی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو خالہ کی ناراضی کا بہت صدمہ ہوا۔ بہت سے لوگوں سے سفارش کرائی، مگر انہوں نے اپنی قسم کا عذر فرما دیا۔ آخر جب عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما بہت ہی پریشان ہوئے تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ننھیال کے دو حضرات کو سفارشی بنا کر ساتھ لے گئے، وہ دونوں حضرات اجازت لے کر اندر گئے، یہ بھی چھپ کر ساتھ ہو لئے۔ جب وہ دونوں پردہ کے پیچھے بیٹھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پردہ کے اندر بیٹھ کر بات چیت فرمانے لگیں، تو یہ جلدی سے پردہ میں چلے گئے اور جا کر خالہ سے لپٹ گئے اور بہت روئے اور خوشامد کی۔ وہ دونوں حضرات بھی سفارش کرتے رہے اور مسلمان سے بولنا چھوڑنے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات یاد دلاتے رہے اور احادیث میں جو ممانعت اس کی آئی ہے وہ سناتے رہے جس کی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان احادیث میں جو ممانعت اور مسلمان سے بولنا چھوڑنے پر جو عِتاب وارد ہوا، اس کی تاب نہ لاسکیں اور رونے لگیں۔ آخر معاف فرما دیا اور بولنے لگیں۔ لیکن اپنی اس قسم کے کفّارہ میں بار بار غلام آزاد کرتی تھیں، حتیٰ

---

[1] طبقات

کہ چالیس غلام آزاد کئے اور جب بھی اس قسم توڑنے کا خیال آجاتا، اتنا روتیں کہ دوپٹہ تک آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔[۱]

ف: ہم لوگ صبح سے شام تک کتنی قسمیں ایک سانس میں کھالیتے ہیں اور پھر اس کی کتنی پرواہ کرتے ہیں، اس کا جواب اپنے ہی سوچنے کا ہے۔ دوسرا شخص کون ہر وقت پاس رہتا ہے جو بتاوے، لیکن جن لوگوں کے ہاں اللہ کے نام کی وقعت ہے اور اللہ سے عہد کر لینے کے بعد پورا کرنا ضروری ہے۔ ان سے پوچھو کہ عہد کے پورا نہ ہونے سے دل پر کیا گذرتی ہے۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو جب یہ واقعہ یاد آتا تھا تو بہت زیادہ روتی تھیں۔

(۴) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حالت اللہ کے خوف سے

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جتنی محبّت تھی وہ کسی سے بھی مخفی نہیں، حتیٰ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو سب سے زیادہ محبّت کس سے ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عائشہ سے۔ اس کے ساتھ ہی مسائل سے اتنی زیادہ واقف تھیں کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم مسائل کی تحقیق کے لئے آپ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کو سلام کرتے تھے۔ جنّت میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ منافقوں نے آپ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو قرآنِ شریف میں آپ رضی اللہ عنہا کی براءۃ نازل ہوئی۔ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دس خصوصیات مجھ میں ایسی ہیں کہ کوئی دوسری بیوی ان میں شریک نہیں۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو مُفصّل نقل کیا ہے۔ صدقہ کی کیفیت پہلے قصوں سے معلوم ہو ہی چکی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود اللہ کے خوف کا یہ حال تھا: فرمایا کرتیں کہ کاش! میں درخت ہی ہوجاتی کہ تسبیح کرتی رہتی اور کوئی آخرت کا مطالبہ مجھ سے نہ ہوتا، کاش! میں پتھر ہوتی، کاش! میں مٹی کا ڈَلا ہوتی، کاش! میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ کاش! میں درخت کا پتا ہوتی، کاش! میں کوئی گھاس ہوتی۔[۲]

ف: اللہ کے خوف کا یہ منظر دوسرے باب کے پانچویں چھٹے قصّہ میں بھی گذر چکا

---

[۱]، [۲] بخاری

ہے۔ ان حضرات کی یہ عام حالت تھی۔ اللہ سے ڈرنا انہیں کا حصّہ تھا۔

(۵) حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے خاوند کی دعا اور ہجرت

اُم المؤمنین حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت اَبوسَلَمہ رضی اللہ عنہ صحابی کے نکاح میں تھیں۔ دونوں میں بہت ہی زیادہ محبّت اور تعلّق تھا جس کا اندازہ اس قصّہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا نے اَبوسلمہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے یہ سنا ہے کہ اگر مرد اور عورت دونوں جنتی ہوں اور عورت[1] مرد کے بعد کسی سے نکاح نہ کرے تو وہ عورت جنّت میں اسی مرد کو ملے گی۔ اسی طرح اگر مرد دوسری عورت سے نکاح نہ کرے تو وہی عورت اسے ملے گی۔ اس لئے لاؤ ہم اور تم دونوں عہد کرلیں کہ ہم میں سے جو پہلے مرجائے تو دوسرا نکاح نہ کرے۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم میرا کہنا مان لوگی۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں تو اسی واسطے مشورہ کررہی ہوں کہ تمہارا کہنا مانوں۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تو میرے بعد تم نکاح کرلینا۔ پھر دعا کی کہ یا اللہ! میرے بعد اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو مجھ سے بہتر خاوند عطا فرما جو نہ اس کو رنج پہنچائے اور نہ تکلیف دے۔ ابتدائے اسلام میں دونوں میاں بیوی نے حبشہ کی ہجرت ساتھ ہی کی۔ اس کے بعد وہاں سے واپسی پر مدینہ طیّبہ کی ہجرت کی۔ جس کا مفصّل قصّہ خود ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب اَبوسلمہ نے ہجرت کا ارادہ کیا تو اپنے اونٹ پر سامان لادا اور مجھے اور میرے بیٹے سلمہ کو سوار کرایا اور خود اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لے کر چلے۔ میرے میکے کے لوگوں بنومغیرہ نے دیکھ لیا۔ انہوں نے ابوسلمہ سے کہا کہ تم اپنی ذات کے بارے میں تو آزاد ہوسکتے ہو، مگر ہم اپنی لڑکی کو تمہارے ساتھ کیوں جانے دیں؟ کہ یہ شہر در شہر پھرے۔ یہ کہہ کر اونٹ کی نکیل ابوسلمہ کے ہاتھ سے چھین لی اور مجھے زبردستی واپس لے آئے۔ میرے سسرال کے لوگ بنوعبدالاَسد کو جو ابوسلمہ کے رشتہ دار تھے جب اس قصّہ کی خبر ملی تو وہ میرے میکہ والوں بنومغیرہ سے جھگڑنے لگے کہ تمہیں اپنی لڑکی کا تو

[1] اگر عورت دوسرے خاوند سے نکاح کرلے تو اس میں دو حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ وہ دوسرے کو ملے گی اور دوسری حدیث میں آیا ہے کہ اس کو اختیار دیدیا جاوے گا کہ جس خاوند کے پاس رہنا چاہے اس کو اختیار کرلے۔ یہ دوسری حدیث زیادہ مشہور ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جن عورتوں کے دونوں خاوند برابر ہوں ان کے حق میں پہلی حدیث ہو۔ اس بارے میں بھی روایات مختلف ہیں کہ ہر شخص کو کتنی بیبیاں ملیں گی۔

اختیار ہے، مگر ہم اپنے لڑکے سلمہ کو تمہارے پاس کیوں چھوڑ دیں؟ جب کہ تم نے اپنی لڑکی کو اس کے خاوند کے پاس نہیں چھوڑا اور یہ کہہ کر میرے لڑکے سلمہ کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ اب میں اور میرا لڑکا اور میرا شوہر تینوں جدا جدا ہو گئے، خاوند تو مدینہ چلے گئے۔ میں اپنے میکہ میں رہ گئی اور بیٹا ددھیال میں پہنچ گیا، میں روز میدان میں نکل جاتی اور شام تک رویا کرتی۔ اسی طرح پورا ایک سال مجھے روتے گذر گیا۔ نہ میں خاوند کے پاس جا سکی، نہ بچہ مجھے مل سکا۔ ایک دن میرے چچازاد بھائی نے میرے حال پر ترس کھا کر اپنے لوگوں سے کہا کہ تمہیں اس مسکینہ پر ترس نہیں آتا کہ اس کو بچہ اور خاوند سے تم نے جدا کر رکھا ہے، اس کو کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ غرض میرے چچازاد بھائی نے کہہ سن کر اس بات پر ان سب کو راضی کر لیا۔ انہوں نے مجھے اجازت دے دی کہ تو اپنے خاوند کے پاس جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ یہ دیکھ کر بنو عبدالاسد نے بھی لڑکا دے دیا، میں نے ایک اونٹ تیار کیا اور بچہ گود میں لے کر اونٹ پر تنہا سوار ہو کر مدینہ کو چل دی۔ تین چار میل چلی تھی کہ ''تنعیم'' میں عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ مجھے ملے۔ مجھ سے پوچھا کہ اکیلی کہاں جا رہی ہو؟ میں نے کہا: اپنے خاوند کے پاس مدینہ جا رہی ہوں۔ انہوں نے کہا کوئی تمہارے ساتھ نہیں؟ میں نے کہا کہ اللہ کی ذات کے سوا کوئی نہیں ہے۔ انہوں نے میرے اونٹ کی نکیل پکڑی اور آگے آگے چل دیئے۔ خدا پاک کی قسم! مجھے عثمان سے زیادہ شریف آدمی کوئی نہیں ملا۔ جب اُترنے کا وقت ہوتا، وہ میرے اونٹ کو بٹھا کر خود علیحدہ درخت کی آڑ میں ہو جاتے۔ میں اتر جاتی اور جب سوار ہونے کا وقت ہوتا، اونٹ کو سامان وغیرہ لاد کر میرے قریب بٹھا دیتے، میں اس پر سوار ہو جاتی اور وہ آ کر اس کی نکیل پکڑ کر آگے آگے چلنے لگتے۔ اسی طرح ہم مدینہ منورہ پہنچے۔ جب قُبا میں پہنچے تو انہوں نے کہا: تمہارا خاوند یہیں ہے، اس وقت تک ابو سلمہ رضی اللہ عنہ قبا ہی میں مقیم تھے۔ عثمان مجھے وہاں پہنچا کر خود مکہ مکرمہ واپس ہو گئے۔ پھر کہا کہ خدا کی قسم! عثمان بن طلحہ سے زیادہ کریم اور شریف آدمی میں نے نہیں دیکھا اور اس سال میں جتنی مشقت اور تکلیف میں نے برداشت کی، شاید ہی کسی نے کی ہو۔[1]

ف: اللہ پر بھروسہ کی بات تھی کہ تنہا ہجرت کے ارادہ سے چل دیں۔ اللہ جل شانہٗ نے

[1] اسد الغابہ

اپنے فضل سے ان کی مدد کا سامان مہیا کر دیا۔ جو اللہ پر بھروسہ کر لیتا ہے، اللہ جل شانہٗ اس کی مدد فرماتا ہے۔ بندوں کے دل اسی کے قبضہ میں ہیں۔ ہجرت کا سفر اگر کوئی محرم نہ ہو تو تنہا بھی جائز ہے بشرطیکہ ہجرت فرض ہو، اس لئے ان کے تنہا سفر پر شرعی اشکال نہیں۔

(۶) حضرت اُمِّ زِیاد رضی اللہ عنہا کی چند عورتوں کے ساتھ خیبر میں شرکت

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مردوں کو تو جہاد کی شرکت کا شوق تھا ہی جس کے واقعات کثرت سے نقل کئے جاتے ہیں۔ عورتیں بھی اس چیز میں مردوں سے پیچھے نہیں تھیں، ہمیشہ مشتاق رہتی تھیں اور جہاں موقع مل جاتا پہنچ جاتیں۔ اُمِ زیاد رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ خیبر کی لڑائی میں ہم چھ عورتیں جہاد میں شرکت کے لئے چل دیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو ہم کو بلایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور پر غصہ کے آثار تھے۔ ارشاد فرمایا کہ تم کس کی اجازت سے آئیں اور کس کے ساتھ آئیں؟ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم کو اون بننا آتا ہے اور جہاد میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ زخموں کی دوائیں بھی ہمارے پاس ہیں، اور کچھ نہیں تو مجاہدین کو تیر ہی پکڑانے میں مدد دیں گی، اور جو بیمار ہوگا اس کی دوا دارو کی مدد ہو سکے گی۔ ستّو وغیرہ گھولنے اور پلانے میں کام دے دیں گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھہر جانے کی اجازت دیدی۔[۱]

ف: حق تعالیٰ شانہٗ نے اس وقت عورتوں میں بھی کچھ ایسا ولولہ اور جرأت پیدا فرمائی تھی جو آج کل مردوں میں بھی نہیں ہے۔ دیکھیے! یہ سب اپنے شوق سے خود ہی پہنچ گئیں اور کتنے کام اپنے کرنے کے تجویز کر لئے۔ ''حنین'' کی لڑائی میں اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا باوجودیکہ حاملہ تھیں، عبداللہ بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ پیٹ میں تھے، شریک ہوئیں اور ایک خنجر ساتھ لئے رہتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ کس لئے ہے؟ عرض کیا کہ اگر کوئی کافر میرے پاس آئے گا تو اس کے پیٹ میں بُھونک دوں گی۔ اس سے پہلے اُحد وغیرہ کی لڑائی میں بھی یہ شریک ہوئی تھیں، زخمیوں کی دوا دارو اور بیماروں کی خدمت کرتی تھیں۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ نہایت مُستعدی سے مَشک بھر کر

---

[۱] ابوداؤد

لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں اور جب خالی ہو جاتی تو پھر بھر لاتیں۔

(۷) حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا کی غزوۃُ البحر میں شرکت کی تمنّا

حضرت اُمِ حرام رضی اللہ عنہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے ان کے گھر تشریف لے جاتے اور کبھی دو پہر وغیرہ کو وہیں آرام بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر آرام فرما رہے تھے کہ مسکراتے ہوئے اٹھے۔ اُمِ حرام رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کس بات پر آپ مسکرا رہے تھے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ مجھے دکھلائے گئے جو سمندر پر لڑائی کے ارادہ سے اس طرح سوار ہوئے جیسے تختوں پر بادشاہ بیٹھے ہوں۔ اُمِ حرام رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: یا رسول اللہ! دعا فرما دیجئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ مجھے بھی ان میں شامل فرما دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم بھی ان میں شامل ہو گی۔ اس کے بعد پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آرام فرمایا اور پھر مسکراتے ہوئے اٹھے۔ اُمِ حرام رضی اللہ عنہا نے پھر مسکرانے کا سبب پوچھا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر اسی طرح ارشاد فرمایا، اُمِ حرام رضی اللہ عنہا نے پھر وہی درخواست کی کہ یا رسول اللہ! آپ دعا فرما دیں کہ میں بھی ان میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم پہلی جماعت میں ہو گی، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو شام کے حاکم تھے جزائر قبرس پر حملہ کرنے کی اجازت چاہی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی، امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر کے ساتھ حملہ فرمایا جس میں اُمِ حرام رضی اللہ عنہا بھی اپنے خاوند حضرت عُبادہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ لشکر میں شریک ہوئیں اور واپسی پر ایک خچر پر سوار ہو رہی تھیں کہ وہ بِدکا اور یہ اس پر سے گر گئیں جس سے گردن ٹوٹ گئی اور انتقال فرما گئیں اور وہیں دفن کی گئیں۔[1]

ف: یہ وَلولہ تھا جہاد میں شرکت کا کہ ہر لڑائی میں شرکت کی دعا کراتی تھیں، مگر چونکہ ان دونوں لڑائیوں میں سے پہلی لڑائی میں انتقال فرمانا متعیّن تھا اس لئے دوسری لڑائی میں شرکت نہ ہو سکی اور اسی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں شرکت کی دعا بھی نہ فرمائی تھی۔

[1] بخاری

(۸) حضرت اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کا لڑکے کے مرنے پر عمل

اُم سلیم رضی اللہ عنہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں جو اپنے پہلے خاوند یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والد کی وفات کے بعد بیوہ ہو گئیں تھیں اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی پرورش کے خیال سے کچھ دنوں تک نکاح نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا جن سے ایک صاحبزادہ ابوعمیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے جن سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب ان کے گھر تشریف لے جاتے تو ہنسی بھی فرمایا کرتے تھے۔ اتفاق سے ابوعمیر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا۔ اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے ان کو نہلایا، دھلایا، کفن پہنایا اور ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا روزہ تھا، اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے ان کے لئے کھانا وغیرہ تیار کیا اور خود اپنے آپ کو بھی آراستہ کیا۔ خوشبو وغیرہ لگائی۔ رات کو خاوند آئے، کھانا وغیرہ بھی کھایا۔ بچہ کا حال پوچھا تو انہوں نے کہہ دیا کہ اب تو سکون معلوم ہوتا ہے، بالکل اچھا ہو گیا، وہ بے فکر ہو گئے۔ رات کو خاوند نے صحبت بھی کی۔ صبح کو جب وہ اٹھے تو کہنے لگیں کہ ایک بات دریافت کرنا تھی۔ اگر کوئی شخص کسی کو مانگی چیز دیدے، پھر وہ اسے واپس لینے لگے تو واپس کر دینا چاہئے یا اسے روک لے، واپس نہ کرے۔ وہ کہنے لگے کہ ضرور واپس کر دینا چاہئے، روکنے کا کیا حق ہے؟ مانگی چیز کا تو واپس کرنا ہی ضروری ہے۔ یہ سن کر اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا کہ تمہارا لڑکا جو اللہ کی امانت تھا وہ اللہ نے لے لیا۔ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اس پر رنج ہوا اور کہنے لگے کہ تم نے مجھ کو خبر بھی نہ دی۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس سارے قصّہ کو عرض کیا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور فرمایا کہ شاید اللہ جل شانہٗ اس رات میں برکت عطا فرماویں۔ ایک انصاری کہتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت دیکھی کہ اس رات کے حمل سے عبداللہ بن ابی طلحہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے جن کے نو بچے ہوئے اور سب نے قرآن شریف پڑھا۔[۱]

ف: بڑے صبر اور ہمت کی بات ہے کہ اپنا بچہ مر جائے اور ایسی طرح اس کو برداشت کرے کہ خاوند کو بھی محسوس نہ ہونے دے، چونکہ خاوند کا روزہ تھا اس لئے خیال ہوا کہ خبر ہونے پر کھانا بھی مشکل ہوگا۔

---

[۱] بخاری، فتح

(۹) حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا اپنے باپ کو بستر پر نہ بٹھانا

اُمُّ المؤمنین حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عبداللہ بن جَحش کے نکاح میں تھیں۔ دونوں خاوند بیوی ساتھ ہی مسلمان ہوئے اور حبشہ کی ہجرت بھی اکٹھے ہی کی۔ وہاں جا کر خاوند مرتد ہو گیا اور اسی حالتِ ارتداد میں انتقال کیا۔ حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے یہ بیوگی کا زمانہ حبشہ ہی میں گذارا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہیں نکاح کا پیام بھیجا اور حبشہ کے بادشاہ کی معرفت نکاح ہوا جیسا کہ باب کے ختم پر بیبیوں کے بیان میں آئے گا۔ نکاح کے بعد مدینہ طیّبہ تشریف لائیں۔ صلح کے زمانہ میں ان کے باپ ابوسفیان مدینہ طیّبہ آئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صلح کی مضبوطی کے لئے گفتگو کرنا تھی۔ بیٹی سے ملنے گئے، وہاں بستر بچھا ہوا تھا، اس پر بیٹھنے لگے تو حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے وہ بستر الٹ دیا۔ باپ کو تعجب ہوا کہ بجائے بستر بچھانے کے اس بچھے ہوئے کو بھی الٹ دیا۔ پوچھا کہ یہ بستر میرے قابل نہیں تھا اس لئے لپیٹ دیا، یا میں بستر کے قابل نہیں تھا؟ حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ اللہ کے پاک اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور تم بوجہ مشرک ہونے کے ناپاک ہو، اس پر کیسے بٹھا سکتی ہوں؟ باپ کو اس بات سے بہت رنج ہوا اور کہا کہ تم مجھ سے جدا ہونے کے بعد بری عادتوں میں مبتلا ہو گئیں، مگر اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عظمت تھی اس کے لحاظ سے وہ کب اس کو گوارا کر سکتی تھیں کہ کوئی ناپاک مشرک، باپ ہو یا غیر ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھ سکے۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چاشت کی بارہ رکعتوں کی فضیلت سنی تو ہمیشہ ان کو پابندی سے نبھا دیا۔ ان کے والد بھی جن کا قصّہ ابھی گذرا ہے بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو تیسرے دن خوشبو منگائی اور اس کو استعمال کیا اور فرمایا کہ مجھے نہ خوشبو کی ضرورت نہ رغبت، مگر میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ عورت کو جائز نہیں کہ خاوند کے علاوہ کسی پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے۔ ہاں! خاوند کے لئے چار مہینہ دس دن ہیں، اس لئے خوشبو استعمال کرتی ہوں کہ سوگ نہ سمجھا جائے۔ جب خود اپنے انتقال کا وقت ہوا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور ان سے کہا کہ میرا تمہارا معاملہ سوکن کا

تھا اور سوکنوں میں آپس میں کسی بات پر تھوڑی بہت رنجش ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ مجھے بھی معاف فرماویں اور تمہیں بھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: اللہ تمہیں سب معاف کرے اور درگذر فرمائیں، یہ سن کر کہنے لگیں کہ تم نے مجھے اس وقت بہت ہی خوشی پہنچائی، اللہ تمہیں بھی خوش وخرم رکھے۔ اس کے بعد اسی طرح اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس بھی آدمی بھیجا۔[1]

ف: سوکنوں کے جو تعلّقات آپس میں ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہا کرتیں، مگر ان کو یہ اہتمام تھا کہ دنیا کا جو معاملہ ہو وہ یہیں نمٹ جائے، آخرت کا بوجھ سر پر نہ رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت اور عظمت کا اندازہ تو اس بسترہ کے معاملہ سے ہو ہی گیا۔

(۱۰) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا اِفک کے معاملہ میں صفائی پیش کرنا

اُم المؤمنین حضرت زینب بنت جَحش رضی اللہ عنہا، رشتہ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن تھیں، شروع ہی زمانہ میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ ابتدا میں آپ کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ سے ہوا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کئے ہوئے غلام تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مُتَبَنّٰی بھی تھے جس کو ''لے پالک'' کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے زید بن محمد کہلاتے تھے، مگر حضرت زید رضی اللہ عنہ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نباہ نہ ہو سکا تو انہوں نے طلاق دے دی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خیال سے کہ زمانۂ جاہلیت کی ایک رسم ٹوٹے، وہ یہ کہ متبنّٰی بالکل ہی بیٹے جیسا ہوتا ہے اور اس کی بیوی سے نکاح بھی نہ کرنا چاہئے، اس لئے اپنے نکاح کا پیام بھیجا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ میں اپنے رب سے مشورہ کرلوں۔ یہ کہہ کر وضو کیا اور نماز کی نیت باندھی کہ اللہ سے مشورہ کئے بغیر میں کچھ جواب نہیں دیتی۔ جس کی برکت یہ ہوئی کہ اللہ جل شانہٗ نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کیا اور قرآنِ پاک کی آیت نازل ہوئی ''فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا'' ۵ (الاحزاب: ۳۷) ''پس جب زید نے اپنی حاجت کو اس سے پورا کرلیا تو ہم نے اس

---

[1] طبقات

کو تمہارے نکاح میں دے دیا تاکہ نہ رہے مومنین پر تنگی اپنے لے پالکوں کی بیبیوں کے بارے میں جب کہ وہ اپنی حاجت ان سے پوری کر چکیں اور اللہ کا حکم ہو کر ہی رہا"۔

جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اس آیت کے نازل ہونے پر نکاح کی خوشخبری دی گئی تو جس نے بشارت دی تھی، اس کو وہ زیور نکال کر دیدیا جو وہ اس وقت پہن رہی تھیں اور خود سجدہ میں گر گئیں اور دو مہینے کے روزوں کی مَنت مانی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو اس بات پر بجا طور پر فخر تھا کہ سب بیبیوں کا نکاح ان کے عزیز رشتہ داروں نے کیا، مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا نکاح آسمان پر ہوا اور قرآنِ پاک میں نازل ہوا۔ اسی وجہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مقابلہ کی نوبت بھی آجاتی تھی کہ ان کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ محبوبہ ہونے پر ناز تھا، اور ان کو آسمان کے نکاح پر ناز تھا، لیکن اس کے باوجود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت کے قصّہ میں جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منجملہ اوروں کے ان سے بھی دریافت کیا۔ تو انہوں نے عرض کیا کہ میں عائشہ میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی۔ یہ تھی سچّی دین داری، ورنہ یہ وقت سوکن کے الزام لگانے کا تھا اور خاوند کی نگاہ سے گرانے کا، بالخصوص اس سوکن کے جو لاڈلی بھی تھی، مگر اسکے باوجود زور سے صفائی کی اور تعریف کی۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی بزرگ تھیں، روزے بھی کثرت سے رکھتی تھیں اور نوافل بھی کثرت سے پڑھتی تھیں، اپنے ہاتھ سے محنت بھی کرتی تھیں اور جو حاصل ہوتا تھا اس کو صدقہ کر دیتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ازواجِ مطہرات نے پوچھا کہ ہم میں سے سب سے پہلے آپ سے کون سی بیوی ملے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا ہاتھ لمبا ہو۔ وہ لکڑی لے کر ہاتھ ناپنے لگیں؟ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ہاتھ کے لمبا ہونے سے بہت زیادہ خرچ کرنا مراد تھا، چنانچہ سب سے پہلے حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہی کا وصال ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ازواجِ مطہرات کی تنخواہ مُقرّر فرمائی اور ان کے پاس ان کے حصّے کا مال بارہ ہزار درہم بھیجے، تو یہ سمجھیں کہ یہ سب کا ہے، فرمانے لگیں کہ تقسیم کے لئے تو اور بیبیاں زیادہ مناسب تھیں۔ قاصد نے کہا کہ یہ سب آپ ہی کا حصّہ ہے اور تمام سال کے لئے ہے تو تعجب سے کہنے لگیں: سبحان اللہ! اور منہ پر کپڑا ڈال لیا کہ اس مال کو دیکھیں

بھی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ حجرہ کے کونہ میں ڈال دیا جائے اور اس پر ایک کپڑا اڈ لوا دیا۔
پھر برزہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا (جو اس قصّہ کو نقل کر رہے ہیں) کہ اس میں سے ایک مٹھی بھر کر
فلاں کو دے آ، اور ایک مٹھی فلاں کو، غرض رشتہ داروں اور غریبوں، بیواؤں کو ایک ایک مٹھی
تقسیم فرما دیا۔ اس میں جب ذرا سا رہ گیا تو برزہ رضی اللہ عنہ نے بھی خواہش ظاہر کی۔ فرمایا کہ جو
کپڑے کے نیچے رہ گیا وہ تم لے جاؤ۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے جو رہ گیا تھا وہ لے لیا اور لے کر
گِنا تو چوراسی درہم تھے۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ یا اللہ! آئندہ سال یہ مال
مجھے نہ ملے کہ اس کے آنے میں بھی فتنہ ہے، چنانچہ دوسرے سال کی تنخواہ آنے سے پہلے ہی
ان کا وصال ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خبر ہوئی کہ وہ بارہ ہزار تو ختم کر دیئے گئے تو انہوں نے
ایک ہزار اور بھیجے کہ اپنی ضرورتوں میں خرچ کریں، انہوں نے وہ بھی اسی وقت تقسیم کر
دیئے۔ باوجود کثرت فتوحات کے انتقال کے وقت نہ کوئی درہم چھوڑا نہ مال، صرف وہ گھر
ترکہ تھا جس میں رہتی تھی۔ صدقہ کی کثرت کی وجہ سے ”مَأْوَی الْمَسَاکِین“ (مساکین کا ٹھکانا)
ان کا لقب تھا۔[۱] ایک عورت کہتی ہیں کہ میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں تھی اور ہم گیرو[۲]
سے کپڑے رنگنے میں مشغول تھے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے، ہم کو رنگتے
ہوئے دیکھ کر واپس تشریف لے گئے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو خیال پیدا ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو یہ چیز ناگوار ہوئی، سب کپڑوں کو جو رنگے تھے فوراً دھو ڈالا۔ دوسرے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم
تشریف لائے، جب دیکھا کہ وہ رنگ کا منظر نہیں ہے تو اندر تشریف لائے۔[۳]

ف: عورتوں کو بالخصوص مال سے جو محبّت ہوتی ہے وہ بھی مخفی نہیں اور رنگ وغیرہ سے
جو اُنس ہوتا ہے وہ بھی محتاجِ بیان نہیں، لیکن وہ بھی آخر عورتیں تھیں جو مال کا رکھنا جانتی ہی نہ
تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمولی سا اشارہ پا کر سارا رنگ دھو ڈالا۔

(۱۱) حضرت خنساء رضی اللہ عنہا کی اپنے چار بیٹوں سمیت جنگ میں شرکت

حضرت خنساء رضی اللہ عنہا مشہور شاعرہ ہیں۔ اپنی قوم کے چند آدمیوں کے ساتھ مدینہ آ کر
مسلمان ہوئیں۔ اِبنِ اَثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی عورت نے

[۱] طبقات، [۲] گیرو: لال رنگ، گہرا گلابی، [۳] ابوداؤد

ان سے بہتر شعر نہیں کہا، نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۱۶ ھ میں قادسیہ کی لڑائی ہوئی جس میں خنساء رضی اللہ عنہا اپنے چاروں بیٹوں سمیت شریک ہوئیں۔ لڑکوں کو ایک دن پہلے بہت نصیحت کی اور لڑائی کی شرکت پر بہت ابھارا، کہنے لگیں کہ میرے بیٹو! تم اپنی خوشی سے مسلمان ہوئے ہو اور اپنی ہی خوشی سے تم نے ہجرت کی، اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں جس طرح تم ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہو اسی طرح ایک باپ کی اولاد ہو، میں نے نہ تمہارے باپ سے خیانت کی، نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا، نہ میں نے تمہاری شرافت میں کوئی دھبہ لگایا، نہ تمہارے نسب کو میں نے خراب کیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اللہ جَلَّ شَانُہٗ نے مسلمانوں کے لئے کافروں سے لڑائی میں کیا کیا ثواب رکھا ہے۔ تمہیں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ آخرت کی باقی رہنے والی زندگی دنیا کی فنا ہو جانے والی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ اللہ جَلَّ شَانُہٗ کا پاک ارشاد ہے: "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝" (آل عمران:۲۰۰) (ترجمہ) "اے ایمان والو! تکالیف پر صبر کرو (اور کفار کے مقابلہ میں) صبر کرو اور مقابلہ کے لئے تیار رہو، تاکہ تم پورے کامیاب ہو"[۱]

لہٰذا کل صبح کو جب تم صحیح وسالم اٹھو تو بہت ہوشیاری سے لڑائی میں شریک ہو اور اللہ تعالیٰ سے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد مانگتے ہوئے بڑھو اور جب تم دیکھو کہ لڑائی زور پر آ گئی اور اس کے شعلے بھڑکنے لگے تو اس کی گرم آگ میں گھس جانا اور کافروں کے سردار کا مقابلہ کرنا۔ ان شاء اللہ جنّت میں اکرام کے ساتھ کامیاب ہو کر رہو گے، چنانچہ جب صبح کو لڑائی زوروں پر ہوئی تو چاروں لڑکوں میں سے ایک ایک نمبر وار آگے بڑھتا تھا اور اپنی ماں کی نصیحت کو اشعار میں پڑھ کر اُمنگ پیدا کرتا تھا اور جب شہید ہو جاتا تھا تو اسی طرح دوسرا بڑھتا تھا اور شہید ہونے تک لڑتا رہتا تھا۔ بالآخر چاروں شہید ہوئے اور جب ماں کو چاروں کے مرنے کی خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ان کی شہادت سے مجھے شرف بخشا۔ مجھے اللہ کی ذات سے اُمید ہے کہ اس کی رحمت کے سایہ میں ان چاروں کے ساتھ میں بھی رہوں گی۔[۲]

---

[۱] بیان القرآن، [۲] اسد الغابہ

ف: ایسی بھی اللہ کی بندی مائیں ہوتی ہیں جو چاروں جوان بیٹوں کو لڑائی کی تیزی اور زور میں گھس جانے کی ترغیب دیں اور جب چاروں شہید ہو جائیں اور ایک ہی وقت میں سب کام آ جائیں تو اللہ کا شکر ادا کریں۔

(۱۲) حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا یہودی کو تنہا مارنا

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی حقیقی بہن تھیں، اُحد کی لڑائی میں شریک ہوئیں اور جب مسلمانوں کو کچھ شکست ہوئی اور بھاگنے لگے تو وہ برچھا ان کے منہ پر مار مار کر واپس کرتی تھیں۔ غزوۂ خندق میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مستورات کو ایک قلعہ میں بند فرما دیا تھا اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بطور محافظ کے چھوڑ دیا تھا۔ یہود کے لئے یہ موقع بہت غنیمت تھا کہ وہ تو اندرونی دشمن تھے ہی۔ یہود کی ایک جماعت نے عورتوں پر حملہ کا ارادہ کیا اور ایک یہودی حالات معلوم کرنے کے لئے قلعہ پر پہنچا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے کہیں سے دیکھ لیا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا: یہ یہودی موقع دیکھنے آیا ہے، تم قلعہ سے باہر نکلو اور اس کو مار دو۔ وہ ضعیف تھے، ضعف کی وجہ سے ان کی ہمت نہ ہوئی تو حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے ایک خیمہ کا کھونٹا اپنے ہاتھ میں لیا اور خود نکل کر اسکا سر کچل دیا۔ پھر قلعہ میں واپس آ کر حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ چونکہ وہ یہودی مرد تھا۔ نامحرم ہونے کی وجہ سے میں نے اس کا سامان اور کپڑے نہیں اتارے، تم اس کے سب کپڑے اتار لاؤ اور اس کا سر بھی کاٹ لاؤ۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ ضعیف تھے جس کی وجہ سے اس کی بھی ہمت نہ فرما سکے تو دوبارہ تشریف لے گئیں اور اس کا سر کاٹ لائیں اور دیوار پر کو یہود کے مجمع میں پھینک دیا۔ وہ دیکھ کر کہنے لگے کہ ہم تو پہلے ہی سے سمجھتے تھے کہ محمد عورتوں کو بالکل تنہا نہیں چھوڑ سکتے ہیں۔ ضرور ان کے محافظ مرد اندر موجود ہیں۔[1]

ف: ۲۰ھ میں حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا وصال ہوا، اس وقت ان کی عمر تہتّر سال کی تھی۔ اس لحاظ سے خندق کی لڑائی میں جو ۵ھ میں ہوئی ان کی عمر اٹھاون سال کی ہوئی۔ آج کل اس عمر کی عورتوں کو گھر کا کام کاج بھی دوبھر ہو جاتا ہے چہ جائیکہ ایک مرد کا اس

[1] اسد الغابہ

طرح تنہا قتل کر دینا اور ایسی حالت میں کہ یہ تنہا عورتیں اور دوسری جانب یہود کا مجمع۔

(۱۳) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا عورتوں کے اجر کے بارے میں سوال

اَسماء بِنتِ یزید رضی اللہ عنہا انصاری صحابیہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان، میں مسلمان عورتوں کی طرف سے بطور قاصد کے حضور کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ بیشک آپ کو اللہ جَلّ شانُہٗ نے مرد اور عورت دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔ اس لئے ہم عورتوں کی جماعت آپ پر ایمان لائی اور اللہ پر ایمان لائی، لیکن ہم عورتوں کی جماعت مکانوں میں گِھری رہتی ہے، پردوں میں بند رہتی ہے، مردوں کے گھروں میں گڑی رہتی ہے اور مردوں کی خواہشیں ہم سے پوری کی جاتی ہیں، ہم ان کی اولاد کو پیٹ میں اٹھائے رہتی ہیں اور ان سب باتوں کے باوجود مرد بہت سے ثواب کے کاموں میں ہم سے بڑھے رہتے ہیں، جمعہ میں شریک ہوتے ہیں، جماعت کی نمازوں میں شریک ہوتے ہیں، بیماروں کی عیادت کرتے ہیں، جنازوں میں شرکت کرتے ہیں، حج پر حج کرتے رہتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر جہاد کرتے رہتے ہیں اور جب وہ حج کے لئے یا عمرہ کے لئے یا جہاد کے لئے جاتے ہیں تو ہم عورتیں ان کے مالوں کی حفاظت کرتی ہیں، ان کے لئے کپڑا بُنتی ہیں، ان کی اولاد کو پالتی ہیں۔ کیا ہم ثواب میں ان کی شریک نہیں؟

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم نے دین کے بارے میں اس عورت سے بہتر سوال کرنے والی کوئی سنی؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم کو خیال بھی نہ تھا کہ عورت بھی ایسا سوال کر سکتی ہے۔ اس کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسماء رضی اللہ عنہا کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ غور سے سن اور سمجھ اور جن عورتوں نے تجھ کو بھیجا ہے ان کو بتا دے کہ عورت کا اپنے خاوند کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور اس کی خوشنودی کو ڈھونڈنا اور اس پر عمل کرنا ان سب چیزوں کے ثواب کے برابر ہے۔ اَسماء رضی اللہ عنہا یہ جواب سن کر نہایت خوش ہوتی ہوئی واپس ہو گئیں[۱]

---

[۱] اسد الغابہ

ف: عورتوں کا اپنے خاوندوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا بہت ہی قیمتی چیز ہے، مگر عورتیں اس سے بہت ہی غافل ہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ عجمی لوگ اپنے بادشاہوں اور سرداروں کو سجدہ کرتے ہیں، آپ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر میں اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کا حکم کرتا تو عورتوں کو حکم کرتا کہ اپنے خاوندوں کو سجدہ کیا کریں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ عورت اپنے رَب کا حق اس وقت تک ادا نہیں کرسکتی جب تک کہ خاوند کا حق ادا نہ کرے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ ایک اونٹ آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: جب یہ جانور آپ کو سجدہ کرتا ہے تو ہم زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور یہی ارشاد فرمایا کہ اگر میں کسی کو حکم کرتا کہ کسی کو اللہ کے سوا سجدہ کرے تو عورت کو حکم کرتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ جو عورت ایسی حالت میں مرے کہ خاوند اس سے راضی ہو وہ جنّت میں جائے گی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر عورت خاوند سے ناراض ہو کر علیحدہ رات گذارے تو فرشتے اس پر لعنت کرتے رہتے ہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ دو آدمیوں کی نماز قبولیت کے لئے آسمان کی طرف اتنی بھی نہیں جاتی کہ سَر سے اوپر ہی ہو جائے: ایک وہ غلام جو اپنے آقا سے بھاگا ہو، اور ایک وہ عورت جو کہ خاوند کی نافرمانی کرتی ہو۔

(۱۴) حضرت اُمِّ عمّارہ رضی اللہ عنہا کا اسلام اور جنگ میں شرکت

حضرت اُمِ عمارہ انصاریہ رضی اللہ عنہا ان عورتوں میں ہیں جو اسلام کے شروع زمانہ میں مسلمان ہوئیں اور ''بیعتُ العَقَبَہ'' میں شریک ہوئیں۔ عقبہ کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اوّل چھپ کر مسلمان کرتے تھے، کیونکہ مشرک و کافر لوگ نومسلموں کو سخت تکلیف پہنچاتے تھے۔ مدینہ کے کچھ لوگ حج کے زمانہ میں آتے تھے اور منیٰ کے پہاڑ میں ایک گھاٹی میں چھپ کر مسلمان ہوتے تھے۔ تیسری مرتبہ جو لوگ مدینہ سے آئے ہیں ان میں یہ بھی تھیں۔ ہجرت کے بعد جب لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ اکثر لڑائیوں میں

شریک ہوئیں، بالخصوص اُحد، حدیبیہ، خیبر، عمرۃُ القضاء، حُنَین اور یَمامہ کی لڑائی میں۔ اُحد کی لڑائی کا قصّہ خود ہی سناتی ہیں کہ میں مشکیزہ پانی کا بھر کر اُحد کو چل دی کہ دیکھوں مسلمانوں پر کیا گذری اور کوئی پیاسا زخمی ملا تو پانی پلادوں گی۔ اس وقت ان کی عمر تینتالیس[۴۳] برس کی تھی۔

ان کے خاوند اور دو بیٹے بھی لڑائی میں شریک تھے، مسلمانوں کو فتح اور غلبہ ہو رہا تھا، مگر تھوڑی دیر میں جب کافروں کا غلبہ ظاہر ہونے لگا تو میں حضور ﷺ کے قریب پہنچ گئی اور جو کافر ادھر کا رخ کرتا تھا اس کو ہٹاتی تھی۔ ابتدا میں ان کے پاس ڈھال بھی نہ تھی، بعد میں ملی جس پر کافروں کا حملہ روکتی تھیں۔ کمر پر ایک کپڑا باندھ رکھا تھا جس کے اندر مختلف چیتھڑے بھرے ہوئے تھے۔ جب کوئی زخمی ہو جاتا تو ایک چیتھڑا نکال کر جلا کر اس زخم میں بھر دیتیں۔ خود بھی کئی جگہ سے زخمی ہوئیں، بارہ تیرہ جگہ زخم آئے، جن میں ایک بہت سخت تھا۔ اُمّ سعید رضی اللہ عنہا کہتی ہیں میں نے ان کے مونڈھے پر ایک بہت گہرا زخم دیکھا، میں نے پوچھا: یہ کس طرح پڑا تھا؟ کہنے لگیں کہ اُحد کی لڑائی میں جب لوگ ادھر ادھر پریشان پھر رہے تھے، تو ابن قَمِیئَہ یہ کہتا ہوا بڑھا کہ محمد (ﷺ) کہاں ہیں، مجھے کوئی بتادو کہ کدھر ہیں؟ اگر آج وہ بچ گئے تو میری نجات نہیں۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور چند آدمی اس کے سامنے آگئے ان میں مَیں بھی تھی، اس نے میرے مونڈھے پر وار کیا، میں نے بھی اس پر کئی وار کئے، مگر اس پر دوہری زِرہ تھی اس لئے زِرہ سے حملہ رک جاتا تھا۔ یہ زخم ایسا سخت تھا کہ سال بھر تک علاج کیا مگر اچھا نہ ہوا۔ اسی دوران میں حضور ﷺ نے ''حَمراءُ الأسد'' کی لڑائی کا اعلان فرمادیا۔ ام عمارہ رضی اللہ عنہا بھی کمر باندھ کر تیار ہوگئیں مگر چونکہ پہلا زخم بالکل ہرا تھا اس لئے شریک نہ ہوسکیں۔

حضور ﷺ جب حمراءُالاسد سے واپس ہوئے تو سب سے پہلے ام عمارہ رضی اللہ عنہا کی خیریت معلوم کی اور جب معلوم ہوا کہ افاقہ ہے تو بہت خوش ہوئے۔ اس زخم کے علاوہ اور بھی بہت سے زخم اُحد کی لڑائی میں آئے تھے۔ ام عمارہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اصل میں وہ لوگ گھوڑے سوار تھے اور ہم پیدل تھے، اگر وہ بھی ہماری طرح پیدل ہوتے جب بات تھی، اس وقت اصل مقابلہ کا پتہ چلتا۔ جب گھوڑے پر کوئی آتا اور مجھے مارتا تو اس کے حملوں کو میں ڈھال پر روکتی رہتی اور جب وہ مجھ سے منہ موڑ کر دوسری طرف چلتا تو میں اس کے گھوڑے کی

ٹانگ پر حملہ کرتی اور وہ کٹ جاتی جس سے وہ بھی گرتا اور سوار بھی گرتا اور جب وہ گرتا تو حضور ﷺ میرے لڑکے کو آواز دے کر میری مدد کو بھیجتے، میں اور وہ دونوں مل کر اس کو نمٹا دیتے۔ ان کے بیٹے عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے بائیں بازو میں زخم آیا اور خون تھمتا نہ تھا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس پر پٹی باندھ لو۔ میری والدہ آئیں، اپنی کمر میں سے کچھ کپڑا نکالا، پٹی باندھی اور باندھ کر کہنے لگیں کہ جا، کافروں سے مقابلہ کر۔ حضورِ اقدس ﷺ اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ فرمانے لگے: اُمِ عمارہ! اتنی ہمت کون رکھتا ہوگا جتنی تو رکھتی ہے۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اس دوران میں ان کو اور ان کے گھرانے کو کئی بار دعائیں بھی دیں اور تعریف بھی فرمائی۔ ام عمارہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ اسی وقت ایک کافر سامنے آیا تو حضور ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ یہی ہے جس نے تیرے بیٹے کو زخمی کیا ہے۔ میں بڑھی اور اس کی پنڈلی پر وار کیا جس سے وہ زخمی ہوا اور ایک دم بیٹھ گیا۔ حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ بیٹے کا بدلہ لے لیا۔ اس کے بعد ہم لوگ آگے بڑھے اور اس کو نمٹا دیا۔ حضور ﷺ نے جب ہم لوگوں کو دعائیں دیں تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! دعا فرمایئے کہ حق تعالیٰ شانہٗ جنّت میں آپ کی رفاقت نصیب فرمائیں۔ جب حضور ﷺ نے اس کی دعا فرمادی تو کہنے لگیں کہ اب مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ دنیا میں مجھ پر کیا مصیبت گذری۔ اُحد کے علاوہ اور بھی کئی لڑائیوں میں ان کی شرکت اور کارنامے ظاہر ہوئے ہیں۔ حضورِ اقدس ﷺ کے وِصال کے بعد اِرتداد کا زور شور ہوا اور یمامہ میں زبردست لڑائی ہوئی، اس میں بھی اُم عمارہ رضی اللہ عنہا شریک تھیں۔ ان کا ایک ہاتھ بھی اس میں کٹ گیا تھا اور اسکے علاوہ گیارہ زخم بدن پر آئے تھے۔ انہیں زخموں کی حالت میں مدینہ طیّبہ پہنچیں۔[1]

ف: ایک عورت کے یہ کارنامے ہیں جن کی عمر اُحد کی لڑائی میں تینتالیس[۴۳] برس کی تھی جیسا کہ پہلے گذرا اور یَمامہ کی لڑائی میں تقریباً باون[۵۲] برس کی۔ اس عمر میں ایسے معرکوں کی اس طرح شرکت کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔

---

[1] طبقات

(۱۵) حضرت اُمِّ حکیم رضی اللہ عنہا کا اسلام اور جنگ میں شرکت

اُمِ حکیم رضی اللہ عنہا بنتِ حارث جو عکرمہ رضی اللہ عنہ بن ابی جہل کی بیوی تھیں اور کُفار کی طرف سے اُحُد کی لڑائی میں بھی شریک ہوئیں تھیں ۔ جب مکّہ مکرمہ فتح ہو گیا تو مسلمان ہو گئیں ۔ خاوند سے بہت زیادہ محبّت تھی، مگر وہ اپنے باپ کے اثر کی وجہ سے مسلمان نہیں ہوئے تھے اور جب مکّہ فتح ہو گیا تو یمن بھاگ گئے تھے ۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے خاوند کے لئے امن چاہا اور خود یمن پہنچیں ۔ خاوند کو بڑی مشکل سے واپس آنے پر راضی کیا اور کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار سے ان کے دامن ہی میں پناہ مل سکتی ہے، تم میرے ساتھ چلو ۔ وہ مدینہ طیّبہ واپس آ کر مسلمان ہوئے اور دونوں میاں بیوی خوش وخرم رہے ۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جب روم کی لڑائی ہوئی تو اس میں عکرمہ رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوئے اور یہ بھی ساتھ تھیں ۔ حضرت عِکرِمہ رضی اللہ عنہ اس میں شہید ہو گئے تو خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کر لیا اور اسی سفر میں ''مرجُ الصّفَر'' ایک جگہ کا نام ہے وہاں رخصتی کا ارادہ کیا ۔ بیوی نے کہا کہ ابھی دشمنوں کا جمگھٹا ہے اس کو نمٹنے دیجئے ۔ خاوند نے کہا کہ مجھے اس معرکہ میں اپنے شہید ہونے کا یقین ہے، وہ بھی چپ ہو گئیں اور وہیں ایک منزل پر خیمہ میں رخصتی ہوئی ۔ صبح کو ولیمہ کا انتظام ہو ہی رہا تھا کہ رومیوں کی فوج چڑھ آئی اور گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں خالد بن سعید رضی اللہ عنہ شہید ہوئے ۔ ام حکیم رضی اللہ عنہا نے اس خیمہ کو اکھاڑا جس میں رات گذری تھی اور اپنا سب سامان باندھا اور خیمہ کا کھونٹا لے کر خود بھی مقابلہ کیا اور سات آدمیوں کو تنِ تنہا نے قتل کیا۔[1]

ف: ہمارے زمانہ کی کوئی عورت تو درکنار مرد بھی ایسے وقت میں نکاح کو تیار نہ ہوتا اور اگر نکاح ہو بھی جاتا تو اس اچانک شہادت پر روتے روتے نہ معلوم کتنے دن سوگ میں گذرتے ۔ اس اللہ کی بندی نے خود بھی جہاد شروع کر دیا اور عورت ہو کر سات آدمیوں کو قتل کیا۔

(۱۶) حضرت سمیہ اُمّ عمّار رضی اللہ عنہا کی شہادت

سمیہ بنت خیاط حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں جن کا قصّہ پہلے باب کے ساتویں نمبر پر

[1] اسد الغابہ

گذر چکا ہے۔ یہ بھی اپنے لڑکے حضرت عمار رضی اللہ عنہ اور اپنے خاوند حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کی طرح اسلام کی خاطر قسم قسم کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتی تھیں، مگر اسلام کی سچّی محبّت جو دل میں گھر کر چکی تھی اس میں ذرا بھی فرق نہ آتا تھا۔ ان کو گرمی کے سخت وقت دھوپ میں کنکریوں پر ڈالا جاتا تھا اور لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں کھڑا کیا جاتا تھا تاکہ دھوپ سے لوہا تپنے لگے اور اس کی گرمی سے تکلیف میں زیادتی ہو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ادھر کو گذر ہوتا تو صبر کی تلقین فرماتے اور جنّت کا وعدہ فرماتے۔ ایک مرتبہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کھڑی تھیں کہ ابوجہل کا ادھر کو گذر ہوا، برا بھلا کہا اور غصّہ میں برچھا شرمگاہ پر مارا جس کے زخم سے انتقال فرما گئیں۔ اسلام کی خاطر سب سے پہلی شہادت انہیں کی ہوئی۔[1]

ف: عورتوں کا اس قدر صبر، ہمت اور استقلال قابلِ رشک ہے، لیکن بات یہ ہے کہ جب آدمی کے دل میں کوئی چیز گھر کر جاتی ہے تو اس کو ہر بات سہل ہو جاتی ہے۔ اب بھی عشق کے بیسیوں قصے اس قسم کے سننے میں آتے ہیں کہ جان دے دی، مگر یہی جان دینا اگر اللہ کے راستہ میں ہو، دین کی خاطر ہو تو دوسری زندگی میں جو مرنے کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہے سرخروئی کا سبب ہے اور اگر کسی دنیاوی غرض سے ہو تو دنیا تو گئی تھی ہی، آخرت بھی برباد ہوئی۔

(۱۷) حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی زندگی اور تنگی

حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سوتیلی بہن مشہور صحابیات میں سے ہیں، شروع ہی میں مسلمان ہو گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ سترہ آدمیوں کے بعد یہ مسلمان ہوئی تھیں۔ ہجرت سے ستائیس سال پہلے پیدا ہوئیں اور جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبّہ پہنچ گئے تو حضرت زید رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بھیجا کہ ان دونوں حضرات کے اہل وعیال کو لے آئیں، ان کے ساتھ ہی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بھی چلی آئیں۔ جب قبا میں پہنچیں تو عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے اور ہجرت کے بعد سب سے پہلی پیدائش ان کی ہوئی۔

---

[1] اسد الغابہ

اس زمانہ کی عام غربت، تنگ دستی، فقر وفاقہ مشہور ومعروف ہے۔ اوراس کے ساتھ ہی اس زمانہ کی ہمت، جفاکشی، بہادری، جرأت ضربُ المثل ہیں۔

بخاری میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا طرزِ زندگی خود ان کی زبان سے نقل کیا ہے۔ فرماتی ہیں کہ جب میرا نکاح زبیر رضی اللہ عنہ سے ہوا تو ان کے پاس نہ مال تھا نہ جائیداد، نہ کوئی خادم کام کرنے والا، نہ کوئی اور چیز۔ ایک اونٹ پانی لاد کر لانے والا اور ایک گھوڑا۔ میں ہی اونٹ کے لئے گھاس وغیرہ لاتی تھی اور کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر دانہ کے طور پر کھلاتی تھی۔ خود میں پانی بھر کر لاتی اور پانی کا ڈول پھٹ جاتا تو اس کو آپ ہی سیتی تھی اور خود ہی گھوڑے کی ساری خدمت گھاس دانہ وغیرہ کرتی تھی اور گھر کا سارا کاروبار بھی انجام دیتی تھی۔ مگر ان سب کاموں میں گھوڑے کی خبر گیری اور خدمت میرے لئے زیادہ مشقت کی چیز تھی۔ روٹی البتہ مجھے اچھی طرح پکانا نہیں آتی تھی تو میں آٹا گوندھ کر اپنے پڑوس کی انصار عورتوں کے یہاں لے جاتی، وہ بڑی سچّی مخلص عورتیں تھیں، میری روٹی بھی پکا دیتی تھیں۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچنے پر زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک زمین جاگیر کے طور پر دے دی جو دو میل کے قریب تھی۔ میں وہاں سے اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیاں لاد کر لایا کرتی تھی۔ میں ایک مرتبہ اسی طرح آرہی تھی اور گٹھری میرے سر پر تھی۔ راستہ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے، اونٹ پر تشریف لا رہے تھے اور انصار کی ایک جماعت ساتھ تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر اونٹ ٹھہرایا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تاکہ میں اس پر سوار ہو جاؤں، مجھے مردوں کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آئی اور یہ بھی خیال آیا کہ زبیر کو غیرت بہت ہی زیادہ ہے، ان کو بھی یہ ناگوار ہوگا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میرے انداز سے سمجھ گئے کہ مجھے اس پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے، میں گھر آئی اور زبیر کو قصّہ سنایا کہ اس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملے اور یہ ارشاد فرمایا۔ مجھے شرم آئی اور تمہاری غیرت کا خیال بھی آیا۔ زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خدا کی قسم! تمہارا گٹھلیاں سر پر رکھ کر لانا میرے لئے اس سے بہت زیادہ گراں ہے (مگر مجبوری یہ تھی کہ یہ حضرات خود تو زیادہ تر جہاد میں اور دین کے دوسرے امور میں مشغول رہتے تھے، اس لئے گھر کے کاروبار عام طور پر عورتوں ہی کو کرنا پڑتے تھے)۔ اس کے بعد میرے باپ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک خادم جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیا تھا

میرے پاس بھیج دیا جس کی وجہ سے گھوڑے کی خدمت سے مجھے خلاصی ملی، گویا بڑی قید سے میں آزاد ہو گئی۔[1]

ف: عرب کا دستور پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے کہ کھجور کی گٹھلیاں کوٹ کر یا چکی میں دَل کر پھر پانی میں بھگو کر جانوروں کو دانہ کے طور پر کِھلاتے ہیں۔

(۱۸) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہجرت کے وقت مال لے جانا اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کا اپنے دادا کو اطمینان دلانا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت فرما کر تشریف لے جا رہے تھے تو اس خیال سے کہ نہ معلوم راستہ میں کیا ضرورت در پیش ہو کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ تھے، اس لئے جو کچھ مال اس وقت موجود تھا، جس کی مقدار پانچ چھ ہزار درہم تھی وہ سب ساتھ لے گئے تھے۔ ان حضرات کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قُحافہ جو نابینا ہو گئے تھے اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، پوتیوں کے پاس تسلّی کے لئے آئے۔ آ کر افسوس سے کہنے لگے کہ میرا خیال ہے کہ ابوبکر نے اپنے جانے کا صدمہ بھی تم کو پہنچایا اور مال بھی شاید سب لے گیا کہ یہ دوسری مشقت تم پر ڈالی۔ اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: میں نے کہا: نہیں دادے ابّا! وہ تو بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے چھوٹی چھوٹی پتھریاں جمع کر کے گھر کے اس طاق میں بھر دیں جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے درہم پڑے رہتے تھے اور ان پر ایک کپڑا ڈال کر دادے کا ہاتھ اس کپڑے پر رکھ دیا جس سے انہوں نے ہاتھ سے یہ اندازہ کیا کہ یہ درہم بھرے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے: خیر! یہ اس نے اچھا کیا۔ تمہارے گذارہ کی صورت اس میں ہو جائے گی۔ اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ خدا کی قسم! کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا، مگر میں نے دادے کی تسلّی کے لئے یہ صورت اختیار کی کہ ان کو اس کا صدمہ نہ ہو۔[2]

ف: یہ دل گردہ کی بات ہے، ورنہ دادے سے زیادہ ان لڑکیوں کو صدمہ ہونا چاہئے تھا اور جتنی بھی شکایت اس وقت دادا کے سامنے کرتیں درست تھا کہ اس وقت کا ظاہری

---

[1] بخاری، فتح۔ [2] مسند احمد

سہارا ان پر ہی تھا۔ ان کے متوجہ کرنے کی بظاہر بہت ضرورت تھی کہ ایک تو باپ کی جدائی، دوسرے گذارہ کی کوئی صورت ظاہراً نہیں۔ پھر مکّہ والے عام طور سے دشمن اور بے تعلّق، مگر اللہ جل شانہٗ نے ایک ایک ادا ان سب حضرات کو، مرد ہوں یا عورت ایسی عطا فرمائی تھی کہ رشک آنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اول میں نہایت مالدار اور بہت بڑے تاجر تھے، لیکن اسلام کی اور اللہ کی راہ میں یہاں تک خرچ فرمایا کہ غزوۂ تبوک میں جو کچھ گھر میں تھا سب ہی کچھ لا دیا جیسا کہ چھٹے باب کے چوتھے قصّے میں مفصّل گذرا ہے، اسی وجہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہیں پہنچایا جتنا ابو بکر کے مال نے۔ میں ہر شخص کے احسانات کا بدلہ دے چکا ہوں، مگر ابوبکر کے احسانات کا بدلہ اللہ ہی دیں گے۔

(۱۹) حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کی سخاوت

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بڑی سخی تھیں۔ اول جو کچھ خرچ کرتی تھیں اندازہ سے ناپ تول کر خرچ کرتی تھیں۔ مگر جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ باندھ باندھ کر نہ رکھا کر اور حساب نہ لگایا کر، جتنا بھی قدرت میں ہو خرچ کر لیا کر، تو پھر خوب خرچ کرنے لگیں۔ اپنی بیٹیوں اور گھر کی عورتوں کو نصیحت کیا کرتی تھیں کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے اور صدقہ کرنے میں ضرورت سے زیادہ ہونے اور بچنے کا انتظار نہ کیا کرو، کہ اگر ضرورت سے زیادتی کا انتظار کرتی رہو گی تو ہونے کا ہی نہیں (کہ ضرورت خود بڑھتی رہتی ہے) اور اگر صدقہ کرتی رہو گی تو صدقہ میں خرچ کر دینے سے نقصان میں نہ رہو گی۔[۱]

ف: ان حضرات کے پاس جتنی تنگی اور ناداری تھی اتنی ہی صدقہ و خیرات اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی گنجائش اور وُسعت تھی۔ آج کل مسلمانوں میں افلاس و تنگی کی عام شکایت ہے، مگر شاید ہی کوئی ایسی جماعت نکلے جو پیٹ پر پتھر باندھ کر گذر کرتی ہو یا ان پر کئی کئی دن کا مسلسل فاقہ ہو جاتا ہو۔

---

۱ طبقات

(۲۰) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ہجرت اور انتقال

دو جہان کے سردار حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا نبوت سے دس برس پہلے جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف تیس برس کی تھی پیدا ہوئیں اور خالہ زاد بھائی ابو العاص بن ربیع سے نکاح ہوا، ہجرت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جا سکیں۔ ان کے خاوند بدر کی لڑائی میں کُفّار کے ساتھ شریک ہوئے اور قید ہوئے۔ اہلِ مکّہ نے جب اپنے قیدیوں کی رہائی کے لئے فدیے ارسال کئے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی اپنے خاوند کی رہائی کے لئے مال بھیجا جس میں وہ ہار بھی تھا جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہیز میں دیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دیکھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی یاد تازہ ہوگئی۔ آبدیدہ ہوئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ سے یہ قرار پایا کہ ابو العاص کو بلا فدیہ کے اس شرط پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ واپس جا کر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مدینہ طیّبہ بھیج دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو لینے کے لئے ساتھ کر دیئے کہ وہ مکّہ سے باہر ٹھہر جائیں اور ان کے پاس تک ابو العاص پہنچوا دیں، چنانچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے دیور کِنانہ کے ساتھ اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوئیں۔ کُفّار کو جب اس کی خبر ہوئی تو آگ بگولہ ہو گئے اور ایک جماعت مُزاحمت کے لئے پہنچ گئی جن میں ہبار بن اسود جو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی کا لڑکا تھا اور اس لحاظ سے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھائی ہوا۔ وہ اور اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ ان دونوں میں سے کسی نے اور اکثروں نے ہبار ہی کو لکھا ہے، حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو نیزہ مارا جس سے وہ زخمی ہو کر اونٹ سے گریں، چونکہ حاملہ تھیں اس وجہ سے پیٹ سے بچہ بھی ضائع ہوا۔ کنانہ نے تیروں سے مقابلہ کیا۔ ابوسفیان نے ان سے کہا کہ محمد کی بیٹی اور اس طرح علی الاعلان چلی جائے، یہ تو گوارا نہیں۔ اس وقت واپس چلو، پھر چپکے سے بھیج دینا۔ کنانہ نے اس کو قبول کر لیا اور واپس لے آئے، دو ایک روز بعد پھر روانہ کیا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا یہ زخم کئی سال تک رہا اور کئی سال اس میں بیمار رہ کر ۸ھ میں انتقال فرمایا، رضی اللہ عنہا وارضاہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ میری سب سے اچھی بیٹی تھی جو میری محبت میں ستائی گئی۔ دفن کے وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود قبر میں اترے اور

دفن فرمایا۔ اترتے وقت بہت رنجیدہ تھے، جب باہر تشریف لائے تو چہرہ کھلا ہوا تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا، تو ارشاد فرمایا کہ مجھے زینب کے ضعف کا خیال تھا۔ میں نے دعا کی کہ قبر کی تنگی اور اس کی سختی اس سے ہٹادی جائے، اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا۔[1]

ف: حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تو صاحبزادی اور دین کی خاطر اتنی مشقت اٹھائی کہ جان بھی اسی میں دی۔ پھر بھی قبر کی تنگی کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی ضرورت پیش آئی تو ہم جیسوں کا کیا پوچھنا، اس لئے آدمی کو اکثر اوقات قبر کے لئے دعا کرنا چاہیئے۔ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تعلیم کی وجہ سے اکثر اوقات عذابِ قبر سے پناہ مانگتے تھے۔ "اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُ بِمَنِّكَ وَكَرَمِكَ وَفَضْلِكَ"۔

(۲۱) حضرت رُبَیِّع بنتِ مُعَوِّذ رضی اللہ عنہا کی غیرتِ دینی

ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا ایک انصاری صحابیہ ہیں۔ اکثر لڑائیوں میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئی ہیں۔ زخمیوں کی دوادارو فرمایا کرتی تھیں اور مقتولین اور شہداء کی نعشیں اٹھا کر لایا کرتی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے پہلے مسلمان ہوگئی تھیں، ہجرت کے بعد شادی ہوئی۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شادی کے دن ان کے گھر تشریف لے گئے تھے، وہاں چند لڑکیاں خوشی میں شعر پڑھ رہی تھیں جن میں انصار کے اسلامی کارنامے اور ان کے بڑوں کا ذکر تھا جو بدر کی لڑائی میں شہید ہوئے تھے، ان میں سے ایک نے یہ مصرعہ بھی پڑھا: "وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَافِيْ غَدٍ" (ہم میں ایک ایسے نبی ہیں جو آئندہ کی باتوں کو جانتے ہیں) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پڑھنے کو منع فرمادیا، کیونکہ آئندہ کے حالات اللہ ہی کو معلوم ہیں۔ ربیع کے والد حضرت مُعَوِّذ رضی اللہ عنہ ابوجہل کے قتل کرنے والوں میں ہیں۔ ایک عورت جس کا نام اسماء رضی اللہ عنہا تھا عطر بیچا کرتی تھی، وہ ایک مرتبہ چند عورتوں کے ساتھ حضرت ربیع رضی اللہ عنہا کے گھر بھی گئی اور ان سے نام حال پتہ وغیرہ جیسے کہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے دریافت کیا، انہوں نے بتادیا۔ ان کے والد کا نام سن کر وہ کہنے لگی کہ تو اپنے سردار کے قاتل کی بیٹی ہے۔ ابوجہل چونکہ عرب کا سردار شمار کیا جاتا تھا۔ اس لئے اپنے سردار کا قاتل کہا۔ یہ سن کر

[1] خمیس

ربیع رضی اللہ عنہا کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگی کہ میں اپنے غلام کے قاتل کی بیٹی ہوں۔ ربیع رضی اللہ عنہ کو غیرت آئی کہ ابوجہل کو اپنے باپ کا سردار سنے، اس لئے انہوں نے اپنے غلام کے لفظ سے ذکر کیا۔ اسماء کو ابوجہل کے متعلق غلام کا لفظ سن کر غصہ آیا اور کہنے لگی کہ مجھ پر حرام ہے کہ تیرے ہاتھ عطر فروخت کروں۔ ربیع رضی اللہ عنہا نے کہا کہ مجھ پر بھی حرام ہے کہ تجھ سے عطر خریدوں، میں نے تیرے عطر کے سوا کسی عطر میں گندگی اور بدبو نہیں دیکھی۔[1]

ف: ربیع رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے بدبو کا لفظ اس کے جلانے کو کہا تھا، یہ حمیّت اور دینی غیرت تھی کہ دین کے اس سخت دشمن کے متعلق وہ سرداری کا لفظ نہ سن سکیں۔ آج کل دین کے بڑے سے بڑے دشمن پر بھی اس سے اونچے اونچے لفظ بولے جاتے ہیں اور کوئی شخص اگر منع کرے تو وہ تنگ نظر بتادیا جاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ منافق کو سردار مت کہو، اگر وہ تمہارا سردار ہو گیا تو تم نے اپنے رب کو ناراض کیا۔[2]

معلومات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں اور اولاد

اپنے آقا اور دو جہان کے سردار حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں اور اولاد کا حال معلوم کرنے کا اشتیاق ہوا کرتا ہے اور ہر مسلمان کو ہونا بھی چاہئے، اس لئے مختصر حال ان کا لکھا جاتا ہے کہ تفصیلی حالات کے لئے تو بڑی ضخیم کتاب چاہئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح جن پر محدثین اور مؤرخین کا اتفاق ہے، گیارہ عورتوں سے ہوا، اس سے زیادہ میں اختلاف ہے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ ان میں سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا[3] سے ہوا جو بیوہ تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اس وقت پچیس برس کی تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس برس کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد بھی بجز حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے سب انہیں سے ہوئی جن کا بیان بعد میں آئے گا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کی سب سے اول تجویز ورقہ بن نوفل سے ہوئی تھی، مگر نکاح کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد دو شخصوں سے نکاح ہوا، اہلِ تاریخ کا

---

۱ اسد الغابہ، ۲ ۳ ابوداؤد

اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں میں پہلے کس سے ہوا۔ اکثر کی رائے یہ ہے کہ پہلے عتیق بن عائذ سے ہوا جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جن کا نام ''ہند'' تھا اور وہ بڑی ہو کر مسلمان ہوئیں اور صاحبِ اولاد بھی، اور بعضوں نے لکھا ہے کہ عتیق سے ایک لڑکا بھی ہوا جس کا نام عبداللہ یا عبد مناف تھا، عتیق کے بعد پھر خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ابوہالہ سے ہوا جن سے ہند اور ہالہ دو اولاد ہوئیں۔ اکثروں نے کہا ہے کہ دونوں لڑکے تھے اور بعضوں نے لکھا ہے کہ ہند لڑکا ہے اور ہالہ لڑکی۔ ''ہند'' حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت تک زندہ رہے۔

ابوہالہ کے انتقال کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا جس وقت کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس برس کی تھی۔ نکاح کے بعد پچیس برس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں اور رمضان ۱۰ ؁ نبوی میں پینسٹھ برس کی عمر میں انتقال فرمایا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بے حد محبت تھی اور ان کی زندگی میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ ان کا لقب اسلام سے پہلے ہی سے ''طاہرہ'' تھا، اسی وجہ سے ان کی اولاد جو دوسرے خاوندوں سے ہے وہ بھی بنو الطّاہرہ کہلاتی ہے۔ ان کے فضائل حدیث کی کتابوں میں کثرت سے ہیں، ان کے انتقال پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود قبر مبارک میں اتر کر ان کو دفن فرمایا تھا۔ نمازِ جنازہ اس وقت تک مشروع نہیں ہوئی تھی۔ ان کے بعد اسی سال شوال میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ اس میں بھی اختلاف ہے کہ ان دونوں میں پہلے کس کا نکاح ہوا۔ بعض مؤرخین نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح پہلے ہونا لکھا ہے اور بعضوں کی رائے یہ ہے کہ حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے پہلے ہوا، بعد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت سَودہ رضی اللہ عنہا بھی بیوہ تھیں، ان کے والد کا نام زَمعہ بن قیس ہے، پہلے سے اپنے چچا زاد بھائی سَکران بن عَمرو کے نکاح میں تھیں۔ دونوں مسلمان ہوئے اور ہجرت فرما کر حَبشہ تشریف لے گئے اور حبشہ میں سکران کا انتقال ہو گیا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ مکّہ واپس آکر انتقال فرمایا۔ ان کے انتقال کے بعد ۱۰ ؁ نبوی میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے

انتقال کے کچھ دنوں بعد ان سے نکاح ہوا اور رخصتی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی سے سب کے نزدیک پہلے ہی ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تو کثرت سے نماز میں مشغول رہنا تھی ہی۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے عرض کیا کہ رات آپ نے اتنا لمبا رکوع کیا کہ مجھے اپنی ناک سے نکسیر نکلنے کا ڈر ہو گیا (یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھیں، چونکہ بدن کی بھاری تھیں اس وجہ سے اور بھی مشقت ہوئی ہوگی) ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے خاوند کی خواہش نہیں، مگر یہ تمنا ہے کہ جنّت میں حضور کی بیویوں میں داخل رہوں، اس لئے مجھے آپ طلاق نہ دیں میں اپنی باری عائشہ کو دیتی ہوں۔ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرما لیا اور اس وجہ سے ان کی باری کا دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حصّہ میں آیا تھا۔ ۵۴ھ یا ۵۵ھ میں اور بعض نے لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اخیر زمانۂ خلافت میں وفات پائی۔ ان کے علاوہ ایک سودہ اور بھی ہیں جو قریش ہی کی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح کا ارادہ فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ مجھے ساری دنیا میں سب سے زیادہ محبوب آپ ہیں، مگر میرے پانچ چھ بچے ہیں۔ مجھے یہ بات گراں ہے کہ وہ آپ کے سرہانے روئیں چلائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس بات کو پسند فرمایا، تعریف کی اور نکاح کا ارادہ ملتوی فرما دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی نکاح مکّہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے شوال ۱۰ نبوی میں ہوا جس وقت کہ ان کی عمر چھ سال کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں صرف یہی ایک ایسی ہیں جن سے کنوارے پن میں نکاح ہوا اور باقی سب سے نکاح بیوگی کی حالت میں ہوا۔ نبوت سے چار سال بعد یہ پیدا ہوئیں اور ہجرت کے بعد جب ان کی عمر کو نواں برس تھا رخصتی ہوئی اور اٹھارہ سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، اور چھیاسٹھ سال کی عمر میں ۱۷ رمضان ۵۷ھ کو منگل کی شب میں ان کا وصال ہوا، خود ہی وصیّت فرمائی تھی کہ مجھے عام قبرستان میں جہاں اور بیبیاں دفن کی گئیں ہیں دفن کیا جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب

حجرہ شریفہ میں نہ دفن کیا جائے۔ چنانچہ ''بقیع'' میں دفن کی گئیں۔

عرب میں یہ مشہور تھا کہ شوال کے مہینہ میں نکاح نامبارک ہوتا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرا نکاح بھی شوال میں ہوا، رخصتی بھی شوال میں ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں کونسی مجھ سے زیادہ نصیبہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ تھی۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد خولہ رضی اللہ عنہا حکیم کی بیٹی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نکاح نہیں کرتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کس سے؟ عرض کیا: کنواری بھی ہے، بیوہ بھی ہے جو منظور ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا تو عرض کیا کہ کنواری تو آپ کے سب سے زیادہ دوست ابوبکر رضی اللہ عنہ کی لڑکی عائشہ ہے اور بیوہ سودہ بنت زمعہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھا تذکرہ کر کے دیکھ لو۔ وہ وہاں سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ اُمِ رومان رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ میں ایک بڑی خیر و برکت لے کر آئی ہوں۔ دریافت کرنے پر کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے عائشہ سے منگنی کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ ام رومان رضی اللہ عنہا نے کہا کہ وہ تو ان کی بھتیجی ہے، اس سے کیسے نکاح ہوسکتا ہے؟ اچھا ابوبکر کو آنے دو، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اس وقت گھر پر موجود نہ تھے۔ ان کے تشریف لانے پر ان سے بھی یہی ذکر کیا۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیا کہ وہ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھتیجی ہے، حضور سے کیسے نکاح ہوسکتا ہے؟ خولہ رضی اللہ عنہا نے جا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ میرے اسلامی بھائی ہیں، ان کی لڑکی سے میرا نکاح جائز ہے، خولہ رضی اللہ عنہا واپس ہوئیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جواب سنایا۔ وہاں کیا دیر تھی۔ کہا: بلالاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نکاح ہوگیا۔ ہجرت کے بعد چند مہینے گذر جانے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ آپ اپنی بیوی عائشہ رضی اللہ عنہا کو کیوں نہیں بلالیتے؟ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سامان مہیّا نہ ہونے کا عذر فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نذرانہ پیش کیا جس سے تیاری ہوئی اور شوال ۱ھ یا ۲ھ میں چاشت کے وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے دولت کدہ پر بِنا یعنی رخصتی ہوئی۔ یہ تین نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت سے پہلے ہوئے۔ اس کے بعد جتنے نکاح ہوئے

وہ ہجرت کے بعد ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نبوت سے پانچ برس قبل مکّہ میں پیدا ہوئیں۔ پہلا نکاح مکّہ ہی میں خنیس بن حذافہ رضی اللہ عنہ سے ہوا، یہ بھی پرانے مسلمان ہیں جنہوں نے حبشہ کی ہجرت کی، پھر مدینہ طیّبہ کی ہجرت کی۔ بدر میں بھی شریک ہوئے اور اسی لڑائی میں یا اُحد کی لڑائی میں ان کے ایسا زخم آیا جس سے اچھے نہ ہوئے اور ۲ھ یا ۳ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے خاوند کے ساتھ ہجرت فرما کر مدینہ طیّبہ ہی آگئیں تھیں۔ جب بیوہ ہوگئیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ میں حفصہ کا نکاح تم سے کرنا چاہتا ہوں، انہوں نے سکوت فرمایا۔ اس کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا جب انتقال ہوا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ذکر فرمایا۔ انہوں نے فرمادیا کہ میرا تو اس وقت نکاح کا ارادہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کی شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں حفصہ کے لئے عثمان سے بہتر خاوند اور عثمان کے لئے حفصہ سے بہتر بیوی بتاتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے ۲ھ یا ۳ھ میں خود نکاح کیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نکاح اپنی صاحبزادی حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا سے کردیا۔ ان کے پہلے خاوند کے انتقال میں مؤرخین کا اختلاف ہے کہ بدر کے زخم سے شہید ہوئے یا اُحد کے۔ بدر ۲ھ میں ہے اور اُحد ۳ھ میں، اسی وجہ سے ان کے نکاح میں بھی اختلاف ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب تم نے حفصہ کے نکاح کا ذکر کیا تھا اور میں نے سکوت کیا تھا، تمہیں اس وقت ناگواری ہوئی ہوگی، مگر چونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے نکاح کا تذکرہ فرماچکے تھے، اس لئے نہ تو میں قبول کرسکتا تھا اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے راز کو ظاہر کرسکتا تھا اس لئے سکوت کیا تھا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ ملتوی فرما دیتے تو میں ضرور کرلیتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے ابوبکر کے سکوت کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

کے انکار سے بھی زیادہ رنج تھا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بڑی عابدہ زاہدہ تھیں، رات کو اکثر جاگتی تھیں اور دن میں کثرت سے روزہ رکھا کرتی تھیں۔ کسی وجہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک طلاق بھی دی تھی جس کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بہت رنج ہوا اور ہونا بھی چاہئے تھا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور عرض کیا: اللہ جَلَّ شَانُہٗ کا ارشاد ہے کہ حفصہ سے رجوع کرلو، یہ بڑی شب بیدار اور کثرت سے روزہ رکھنے والی ہیں اور عمر کی خاطر بھی منظور ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رجوع فرمالیا۔ جمادی الاولیٰ ۴۵ھ میں جب کہ ان کی عمر تقریباً تریسٹھ برس کی تھی مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا۔ بعض نے ان کا انتقال ۴۱ھ میں اور عمر ساٹھ برس کی لکھی ہے۔ ان کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے ہوا۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت زینب رضی اللہ عنہا خزیمہ کی بیٹی جن کے پہلے نکاح میں اختلاف ہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ پہلے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا تھا۔ جب وہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے جن کا قصّہ باب نمبر ے کی پہلی حدیث میں گذرا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا اور بعض نے لکھا کہ ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث سے ہوا تھا، ان کے طلاق دینے کے بعد ان کے بھائی عبیدۃ بن الحارث رضی اللہ عنہ سے ہوا جو بدر میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہجرت کے اکتیس ۳۱ مہینے بعد رمضان ۳ھ میں ہوا۔ آٹھ مہینے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں رہیں اور ربیع الآخر ۴ھ میں انتقال فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا دو ہی بیبیاں ایسی ہیں جن کا وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوا، باقی نو ۹ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت زندہ تھیں جن کا بعد میں انتقال ہوا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی سخی تھیں، اسی وجہ سے ان کا نام اسلام سے پہلے بھی امُّ المساکین (مسکینوں کی ماں) تھا۔ ان کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہوا،

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا ابو امیہ کی بیٹی تھیں جن کا پہلا نکاح اپنے چچا زاد بھائی ابو سلمہ

سے ہوا تھا جن کا نام عبداللہ بن عبدالاسد تھا۔ دونوں میاں بیوی ابتدائی مسلمانوں میں ہیں ،کفّار کے ہاتھ سے تنگ آ کر اوّل دونوں نے حبشہ کی ہجرت کی ، وہاں جا کر ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام سلمہ رضی اللہ عنہ تھا۔ حبشہ سے واپسی کے بعد مدینہ طیّبہ کی ہجرت کی جس کا قصّہ اسی باب کے نمبر ۵ پر مفصّل گذر چکا ہے۔ مدینہ منورہ پہنچ کر ایک لڑکا عمر اور دو لڑکیاں دُرّہ اور زینب پیدا ہوئیں۔ ابوسلمہ رضی اللہ عنہ دس آدمیوں کے بعد مسلمان ہوئے تھے، بدر اور اُحد کی لڑائی میں بھی شریک ہوئے تھے۔ اُحد کی لڑائی میں ایک زخم آ گیا تھا جس کی وجہ سے بہت تکلیف اٹھائی۔ اس کے بعد صفر ۴ھ میں ایک سریہ میں تشریف لے گئے تو واپسی پر وہ زخم پھر ہرا ہو گیا اور اسی میں آٹھ جمادی الاخری ۴ھ میں انتقال کیا۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اس وقت حاملہ تھیں اور زینب پیٹ میں تھیں، جب وہ پیدا ہوئیں تو عدت پوری ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نکاح کی خواہش فرمائی تو انہوں نے عذر کر دیا۔ اس کے بعد حضورِ اقدس ﷺ نے ارادہ فرمایا۔ انہوں نے عرض کیا کہ میرے بچے بھی ہیں اور میرے مزاج میں غیرت کا مضمون بہت ہے اور میرا کوئی ولی یہاں ہے نہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بچوں کا اللہ محافظ ہے اور یہ غیرت بھی ان شاء اللہ جاتی رہے گی اور کوئی ولی اس کو ناپسند نہیں کرے گا۔ تو انہوں نے اپنے بیٹے سلمہ سے کہا کہ حضور ﷺ سے میرا نکاح کر دو۔ اخیر شوال ۴ھ میں حضور ﷺ سے نکاح ہوا۔ بعض نے ۳ھ میں اور بعض نے ۲ھ میں لکھا ہے۔ اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا تھا کہ جس شخص کو کوئی مصیبت پہنچے اور وہ یہ دعا کرے: "اَللّٰهُمَّ أجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاخْلُفْنِيْ خَيْرًا مِّنْهَا" (اے اللہ! مجھے اس مصیبت میں اجر عطا فرما اور اس کا نعم البدل نصیب فرما) تو اس کو اللہ جل شانہٗ بہترین بدل عطا فرماتے ہیں۔ ابوسلمہ کے مرنے پر میں یہ دعا تو پڑھ لیتی ، مگر یہ سوچتی تھی کہ ابوسلمہ سے بہتر کون ہو سکتا ہے، اللہ جل شانہٗ نے حضور ﷺ سے نکاح کرا دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ان کے حسن کی بہت شہرت تھی۔ جب نکاح ہو گیا تو میں نے چھپ کر حیلہ سے جا کر دیکھا تو جیسا سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔ میں نے حفصہ سے اس کا ذکر کیا، انہوں نے کہا: نہیں ایسی حسین نہیں ہیں جتنی شہرت ہے۔ اُمہاتُ المؤمنین میں سب

سے اخیر میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ۵۹ ھ یا ۶۲ ھ میں ہوا۔ اس وقت چوراسی ۸۴ سال کی عمر تھی، اس لحاظ سے نبوت سے تقریباً نو برس پہلے پیدا ہوئیں۔ حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ان سے نکاح ہوا اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مکان میں مقیم ہوئیں۔ انہوں نے وہاں دیکھا کہ ایک مٹکے میں جَو رکھے ہیں اور ایک چکی اور ہانڈی بھی۔ انہوں نے جَو خود پیسے اور چکنائی ڈال کر ملیدہ تیار کیا اور پہلے ہی دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ ملیدہ کھلایا جو نکاح کے دن اپنے ہی ہاتھ سے پکایا تھا۔ ان کے بعد حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا سے ہوا۔

زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا کے حالات

یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن ہیں، ان کا پہلا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبنّی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کیا تھا۔ ان کے طلاق دینے کے بعد اللہ جل شانہٗ نے خود ان کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کر دیا جس کا قصہ سورۂ احزاب میں بھی ہے، اس وقت ان کی عمر پینتیس ۳۵ سال کی تھی۔ مشہور قول کے موافق ذیقعدہ ۵ ھ میں نکاح ہوا۔ بعض نے ۳ ھ میں لکھا، مگر صحیح ۵ ھ ہے اور اس حساب سے نبوت سے گویا سترہ سال قبل ان کی پیدائش ہوئی۔ ان کو اس بات پر فخر تھا کہ سب عورتوں کا نکاح ان کے اولیاء نے کیا اور ان کا نکاح اللہ جل شانہٗ نے کیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جب ان کو طلاق دی اور عدت پوری ہوگئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پاس پیام بھیجا۔ انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ میں اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتی جب تک اپنے اللہ سے مشورہ نہ کرلوں اور یہ کہہ کر وضو کیا اور نماز کی نیت باندھ لی اور یہ دعا کی کہ یا اللہ! تیرے رسول مجھ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، اگر میں ان کے قابل ہوں تو میرا نکاح ان سے فرما دے۔ ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف کی آیت "فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا" (الاحزاب: ۳۷) نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشخبری بھیجی، حضرت زینب رضی اللہ عنہا خوشی کی وجہ سے سجدہ میں گر گئیں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے نکاح کا ولیمہ بڑی شان سے کیا۔ بکری ذبح کی اور گوشت روٹی کی دعوت فرمائی۔ ایک ایک جماعت

کو بلایا جاتا تھا اور جب وہ فارغ ہو جاتی تو دوسری جماعت اسی طرح بلائی جاتی تھی، حتیٰ کہ سب ہی لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی سخی تھیں اور بڑی محنتی، اپنے ہاتھ سے محنت کرتیں اور جو حاصل ہوتا وہ صدقہ کر دیتیں۔ ان ہی کے بارے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ سے سب سے پہلے مرنے کے بعد وہ ملے گی جس کا ہاتھ لمبا ہوگا۔ بیبیاں ظاہری لمبائی سمجھیں، اس لئے لکڑی لے کر سب کے ہاتھ ناپنے شروع کر دیئے۔ دیکھنے میں حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کا ہاتھ سب سے لمبا ملا۔ مگر جب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال سب سے پہلے ہوا جب سمجھیں کہ ہاتھ کی لمبائی سے مراد صدقہ کی کثرت تھی۔ روزے بھی بہت زیادہ رکھتی تھیں، ۲۰ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پچاس برس کی عمر تھی۔ ان کا قصّہ اسی باب کے نمبر ۱۰ پر بھی گذرا ہے۔ ان کے بعد آپ ﷺ کا نکاح حضرت جویریہ بنت الحارث بن ابی ضرار سے ہوا۔

حضرت جُویریہ رضی اللہ عنہا بنت الحارث بن ابی ضرار کے حالات

یہ غزوۂ مُریسیع میں قید ہو کر آئیں تھیں اور غنیمت میں حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے حصّہ میں آئیں۔ قید ہونے سے پہلے مُسافع بن صفوان کے نکاح میں تھیں۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے ان کو نو۹ اوقیہ سونے پر مکاتب کر دیا۔ مکاتب اس غلام یا باندی کو کہتے ہیں جس سے یہ مقرّر کر لیا جاوے کہ اتنے دام تم اگر دے دو تو تم آزاد۔ ایک اُوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے اور ایک درہم تقریباً ساڑھے تین آنے کا[1]۔ اس حساب سے نو اُوقیہ کی قیمت ۸۷ روپے ۱۲ آنے ہوئی اور چار آنے کا اگر درہم ہو تو ۹۰ روپے ہوئی۔ حضور ﷺ کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں اپنی قوم کے سردار حارث کی بیٹی جویریہ ہوں، جو مصیبت مجھ پر نازل ہوئی آپ کو معلوم ہے۔ اب اتنی مقدار پر میں مکاتب ہوئی ہوں اور یہ مقدار میری طاقت سے باہر ہے۔ آپ کی امید پر آئی ہوں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تجھے اس سے بہتر راستہ بتاؤں کہ تجھے مال ادا کر کے آزاد کرا دوں اور تجھ سے نکاح کر لوں۔ ان کے لئے اس سے بہتر کیا تھا؟ بخوشی منظور کر لیا اور ۵ھ میں مشہور قول کے موافق اور بعضوں نے ۶ھ میں اس

[1] کتاب ہذا کی تصنیف کے وقت یہ قیمت تھی، دراصل درہم ساڑھے تین ماشہ چاندی کے ایک قدیم سکّہ کا نام ہے۔

قصہ کو بتایا ہے، نکاح ہو گیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب سنا کہ بنو المصطلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرال بن گئے تو انہوں نے بھی اس رشتہ کے اعزاز میں اپنے اپنے غلام آزاد کر دیئے۔ کہتے ہیں کہ ایک حضرت جویریہ کی وجہ سے سو گھرانے آزاد ہوئے جن میں تقریباً سات سو آدمی تھے۔ اس قسم کی مصلحتیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سب نکاحوں میں تھیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نہایت حسین تھیں، چہرے پر ملاحت تھی۔ کہتے ہیں کہ جو نگاہ پڑ جاتی تھی اٹھتی نہ تھی۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا نے اس لڑائی سے تین دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا کہ یثرب[1] سے ایک چاند چلا اور میری گود میں آ گیا۔ کہتی ہیں کہ جب میں قید ہوئی تو مجھے اپنے خواب کی تعبیر کی امید بندھی۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی اور ربیع الاول ۵۰ھ میں صحیح قول کے موافق پینسٹھ برس کی عمر میں مدینہ طیبہ میں انتقال فرمایا۔ اور بعضوں نے ان کا انتقال ۵۶ھ میں ستر برس کی عمر میں لکھا ہے۔

حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا کے حالات

اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا، ابو سفیان کی صاحبزادی، ان کے نام میں اختلاف ہے، اکثروں نے ''رَملہ'' اور بعضوں نے ''ہِند'' بتایا ہے۔ ان کا پہلا نکاح عبید[2] اللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ میں ہوا تھا۔ دونوں میاں بیوی مسلمان ہو گئے تھے۔ کفار کی تکالیف کی بدولت وطن چھوڑنا پڑا اور حبشہ کی ہجرت دونوں نے کی، وہاں جا کر خاوند نصرانی ہو گیا۔ یہ اسلام پر باقی رہیں۔ انہوں نے اسی رات میں اپنے خاوند کو خواب میں نہایت بُری شکل میں دیکھا۔ صبح کو معلوم ہوا کہ وہ نصرانی ہو گیا ہے۔ اس تنہائی میں اس حالت میں ان پر کیا گذری ہو گی، اللہ ہی کو معلوم ہے۔ لیکن حق تعالیٰ شانہٗ نے اس کا نعم البدل یہ عطا فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آ گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس پیام بھیجا کہ ان کا نکاح مجھ سے کر دو، چنانچہ نجاشی نے ایک عورت ابرہہ کو انکے پاس اس کی خبر کے لئے بھیجا، انہوں نے خوشی میں اپنے دونوں کنگن جو پہن رہی تھیں اس کو عطا کر دیئے اور پاؤں کے چھلے، کڑے وغیرہ متعدد چیزیں دیں۔ نجاشی نے نکاح کیا اور اپنے پاس

---

[1] مدینہ منورہ کا قدیم نام ہے، [2] سیر الصحابہ، جلد دوم

سے چار سو دینار مہر کے ادا کیے اور بہت کچھ سامان دیا۔ جو لوگ مجلسِ نکاح میں موجود تھے ان کو بھی دینار دیئے اور کھانا کھلایا۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ نکاح ۷ھ میں ہوا جیسا کہ اکثر کا قول ہے یا ۶ھ میں جیسا کہ بعض نے کہا ہے، صاحبِ تاریخ خمیس نے لکھا ہے کہ ان کا نکاح ۶ھ میں ہوا اور رخصتی ۷ھ میں جب یہ مدینہ طیبہ پہنچیں۔ نجاشی نے بہت سی خوشبو اور سامان جہیز وغیرہ دے کر ان کو نکاح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیا۔ بعض کتب تواریخ اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے باپ نے نکاح کیا، مگر یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ ان کے باپ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ اس قصہ کے بعد مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کا ایک قصہ اسی باب کے نمبر ۹ پر گذر چکا ہے۔ ان کے انتقال میں بہت اختلاف ہے۔ اکثر نے ۴۴ھ بتایا ہے اور اس کے علاوہ ۴۲ھ اور ۵۵ھ اور ۵۰ھ وغیرہ اقوال بھی ہیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا حُیَیّ کی بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں ہیں۔ اوّل سَلّام بن مِشکم کے نکاح میں تھیں، اس کے بعد کنانہ بن اَبی حُقیق کے نکاح میں آئیں۔ اس سے نکاح اس زمانہ میں ہوا تھا کہ خیبر کی لڑائی شروع ہو گئی تھی اور ان کا خاوند قتل ہو گیا تھا۔ خیبر کی لڑائی کے بعد دِحیہ کلبی رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک باندی مانگی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو مرحمت فرما دی۔ چونکہ مدینہ میں بھی دو قبیلے قریظہ اور نضیر آباد تھے اور یہ سردار کی بیٹی تھیں اس لئے لوگوں نے عرض کیا کہ یہ بات بہت سے لوگوں کو ناگوار ہوگی۔ صفیہ کو اگر حضور اپنے نکاح میں لے لیں تو بہت سے لوگوں کی دل داری ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کو خاطر خواہ عوض دے کر ان کو لے لیا اور ان کو آزاد فرما کر نکاح کر لیا اور خیبر سے واپسی میں ایک منزل پر ان کی رخصتی ہوئی۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس کے پاس جو کھانے کی چیز ہو وہ لے آئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس مُتفرّق چیزیں کھجور، پنیر، گھی وغیرہ جو تھا وہ لے آئے، ایک چمڑے کا دسترخوان بچھا دیا اور اس پر وہ سب ڈال دیا گیا اور سب نے شریک ہو کر کھا لیا۔ یہی ولیمہ تھا۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اختیار دے دیا تھا کہ اگر تم اپنی قوم اور اپنے ملک میں رہنا چاہو تو آزاد ہو، چلی جاؤ اور میرے پاس میرے نکاح میں رہنا چاہو تو رہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں شرک کی حالت میں حضور کی تمنّا کرتی تھی، اب مسلمان ہو کر کیسے جا سکتی ہوں؟ اس سے مراد غالبًا ان کا وہ خواب ہے جو انہوں نے مسلمان ہونے سے پہلے دیکھا تھا کہ ایک چاند کا ٹکڑا میری گود میں ہے۔ اس خواب کو انہوں نے اپنے خاوند کِنانہ سے کہا، اس نے ایک طمانچہ اس زور سے منہ پر مارا کہ آنکھ پر اس کا نشان پڑ گیا اور یہ کہا کہ تو یثرب کے بادشاہ سے نکاح کی تمنّا کرتی ہے۔ ایک مرتبہ خواب دیکھا تھا کہ آفتاب ان کے سینہ پر ہے، خاوند سے اس کو بھی ذکر کیا۔ اس نے اس پر بھی یہی کہا کہ تو یہ چاہتی ہے کہ یثرب کے بادشاہ کے نکاح میں جائے۔ ایک مرتبہ انہوں نے چاند کو گود میں دیکھا تو اپنے باپ سے ذکر کیا، اس نے بھی ایک طمانچہ مارا اور یہ کہا کہ تیری نگاہ یثرب کے بادشاہ پر جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ چاند کا وہی ایک خواب خاوند اور باپ دونوں سے کہا ہو یا چاند دو مرتبہ دیکھا ہو۔ رمضان ۵۰ھ میں صحیح قول کے موافق انتقال ہوا اور تقریباً ساٹھ برس کی عمر پائی۔ خود کہتی ہیں کہ میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئی تو میری عمر سترہ سال کی نہیں ہوئی تھی۔

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے حالات

ام المؤمنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا حارث بن حَزَن کی بیٹی ہیں، ان کا اصل نام برّہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدل کر میمونہ رضی اللہ عنہا رکھا، پہلے سے ابورحم بن عبدالعزّٰی کے نکاح میں تھیں۔ اکثر مؤرخین کا یہی قول ہے اور بہت سے اقوال ان کے پہلے خاوند کے نام میں ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی دو نکاح ہوئے تھے۔ بیوہ ہو جانے کے بعد ذیعقدہ ۷ھ میں جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عمرہ کے لئے مکّہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے موضع سَرِف میں نکاح ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ عمرہ سے فراغت کے بعد مکّہ رخصتی ہو جائے، مگر مکّہ والوں نے قیام کی اجازت نہ دی، اس لئے واپسی میں سرف ہی میں رخصتی ہوئی اور سرف ہی میں خاص اسی جگہ جہاں رخصتی کا خیمہ تھا ۵۱ھ میں صحیح قول کے موافق

انتقال ہوا اور بعض نے ۶۱ھ میں لکھا ہے۔ اس وقت ان کی عمر اکیاسی برس کی تھی اور اسی جگہ قبر بنی۔ یہ بھی عبرت کا مقام ہے اور تاریخ کا عجیبہ ہے کہ ایک سفر میں وہاں نکاح ہوا اور دوسرے سفر میں وہاں رخصتی اور عرصہ کے بعد اسی جگہ قبر بنی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میمونہ ہم سب میں زیادہ متّقی اور صلہ رحمی کرنے والی تھیں۔ یزید بن اَصَم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان کا مشغلہ ہر وقت نماز تھا یا گھر کا کام، اگر دونوں سے فراغت ہوتی تو مسواک کرتی رہتی تھیں۔ جن عورتوں کے نکاح پر محدِّثین و مؤرخین کا اتفاق ہے ان میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سب سے آخری نکاح ہے۔ ان کی درمیانی ترتیب میں البتہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے ان نکاحوں کی تاریخ کا اختلاف ہے جیسا کہ مختصر طور پر معلوم ہوا، ان گیارہ بیویوں میں سے دو کا وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہو چکا تھا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت زینب بنت خُزیمہ رضی اللہ عنہا کا۔ باقی نو بیبیاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت موجود تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض نکاح بعض محدِّثین و مؤرخین نے لکھے ہیں جن کے ہونے میں اختلاف ہے، اس لئے انہیں بیبیوں کا ذکر لکھا ہے جن پر اتفاق ہے۔

معلومات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

مؤرخین اور محدِّثین کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چار لڑکیاں ہوئیں اور اکثر کی تحقیق یہ ہے کہ ان میں سب سے بڑی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں، پھر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا، پھر حضرت اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا، پھر حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا۔ لڑکوں میں البتہ بہت اختلاف ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب حضرات بچپن ہی میں انتقال فرما گئے تھے اور عرب میں اس زمانہ میں تاریخ کا اہتمام کچھ ایسا نہ تھا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے جاں نثار بھی اس وقت تک کثرت سے نہیں ہوئے تھے جو ہر بات پوری پوری محفوظ رہتی۔ اکثر کی تحقیق یہ ہے کہ تین لڑکے حضرت قاسم رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ ہوئے، بعضوں نے کہا کہ چوتھے صاحبزادے حضرت طیب رضی اللہ عنہ اور پانچویں حضرت طاہر رضی اللہ عنہ تھے۔ اس طرح پانچ ہوئے

اور بعض کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر دونوں ایک ہی صاحبزادے کے نام ہیں، اس طرح چار ہوئے اور بعض نے کہا کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ہی کا نام طیب اور طاہر تھا۔ اس طرح تین ہی لڑکے ہوئے اور بعضوں نے دو لڑکے اور بھی بتائے: مُطَیَّب رضی اللہ عنہ اور مُطَہَّر رضی اللہ عنہ، اور لکھا ہے کہ طیب رضی اللہ عنہ اور مطیب رضی اللہ عنہ ایک ساتھ پیدا ہوئے اور طاہر رضی اللہ عنہ اور مطہر رضی اللہ عنہ ایک ساتھ پیدا ہوئے۔ اس طرح سات لڑکے ہوئے، لیکن اکثر کی تحقیق تین لڑکوں کی ہے اور حضور ﷺ کی ساری اولاد حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے سوا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہی سے پیدا ہوئی۔

لڑکوں میں حضرت قاسم رضی اللہ عنہ سب سے پہلے پیدا ہوئے، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ان سے بڑی تھیں یا چھوٹی۔ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ نے بچپن ہی میں انتقال فرمایا، دو سال کی عمر اکثر نے لکھی ہے اور بعضوں نے اس سے کم یا زیادہ بھی لکھی ہے۔

دوسرے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جو نبوت کے بعد پیدا ہوئے اور اسی وجہ سے ان کا نام طیب اور طاہر بھی پڑا اور بچپن ہی میں انتقال ہوا۔ ان کے انتقال پر، بعضوں نے لکھا ہے کہ حضرت قاسم رضی اللہ عنہ کے انتقال پر کُفّار بہت خوش ہوئے کہ آپ ﷺ کی نسل منقطع ہوگئی جس پر سورۂ اِنَّا اَعْطَیْنَا نازل ہوئی اور کُفّار کے اس کہنے کا کہ جب نسل ختم ہو گئی تو کچھ دنوں میں نام مبارک بھی مٹ جائے گا۔ یہ جواب ملا کہ آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد تک بھی حضور ﷺ کے نام کے فدائی کروڑوں موجود ہیں۔

تیسرے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ تھے جو ہجرت کے بعد مدینہ طیّبہ میں بالاتفاق ذی الحجہ ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ یہ حضور ﷺ کی باندی حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا کے پیٹ سے پیدا ہوئے اور حضور ﷺ کی سب سے آخری اولاد ہیں۔ حضور ﷺ نے ساتویں دن ان کا عقیقہ کیا اور دو مینڈھے ذبح کئے اور بالوں کے برابر چاندی صدقہ فرمائی اور بالوں کو دفن کرایا۔ اُبو ہِند بَیاضی رضی اللہ عنہ نے سر کے بال اتارے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنے باپ حضرت ابراہیم کے نام پر نام رکھا ہے اور سولہ مہینے کی عمر میں ان صاحبزادہ نے بھی ۱۰ ربیع الاول ۱۰ھ میں انتقال فرمایا، بعضوں نے اٹھارہ مہینے کی عمر بتلائی ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کے لئے جنّت میں دودھ پلانے والی تجویز ہوگئی۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے حالات

صاحبزادیوں میں سب سے بڑی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں اور جن مؤرخین نے اس کے خلاف لکھا ہے غلط ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح سے پانچ برس بعد جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف تیس برس کی تھی پیدا ہوئیں اور اپنے والدین کے آغوش میں جوان ہوئیں، مسلمان ہوئیں اور اپنے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع سے نکاح ہوا۔ غزوۂ بدر کے بعد ہجرت کی جس میں مشرکین کی ناپاک حرکتوں سے زخمی ہوئیں جس کا قصہ اس باب کے نمبر ۲۰ پر گذر چکا ہے اور اسی بیماری کا سلسلہ اخیر تک چلتا رہا یہاں تک کہ ۸ ھ کے شروع میں انتقال فرمایا۔ ان کے خاوند بھی ۶ ھ یا ۷ ھ میں مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچ گئے تھے اور انہی کے نکاح میں رہیں۔ ان سے دو بچے ہوئے، ایک لڑکا، ایک لڑکی، لڑکے کا نام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھا جنہوں نے اپنی والدہ کے انتقال کے بعد بلوغ کے قریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں انتقال فرمایا۔ فتح مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اونٹنی پر جو سوار تھے وہ یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے۔ لڑکی کا نام حضرت امامہ رضی اللہ عنہا تھا جن کے متعلق حدیث کی کتابوں میں کثرت سے قصہ آتا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں سجدہ کرتے تو یہ کمر پر سوار ہو جاتیں۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تک زندہ رہیں۔ حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے وصال کے بعد جوان کی خالہ تھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا اور ان کے وصال کے بعد مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کوئی اولاد ان سے نہیں ہوئی البتہ مغیرہ رضی اللہ عنہ سے بعضوں نے ایک لڑکا یحییٰ لکھا ہے اور بعضوں نے انکار کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خود وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح بھانجی سے کر دیا جائے، ان کا انتقال ۵۰ ھ میں ہوا۔

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں جو اپنی بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے تین برس بعد پیدا ہوئیں جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تینتیس برس کی تھی اور بعضوں نے حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے بڑا بتایا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا

سے چھوٹی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب کے بیٹے عُتْبہ سے نکاح ہوا تھا۔ جب سورۂ تبت نازل ہوئی تو ابولہب نے ان سے اور ان کے دوسرے بھائی عُتَیْبہ سے (جس کے نکاح میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں) یہ کہا کہ میری ملاقات تم دونوں سے حرام ہے اگر تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو، اس پر دونوں نے طلاق دے دی۔ یہ دونوں نکاح بچپن میں ہوئے تھے، رخصتی کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد فتحِ مکّہ پر حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے خاوند عتبہ مسلمان ہوگئے تھے، مگر بیوی کو پہلے ہی طلاق دے چکے تھے اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرصہ ہوا ہو چکا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا نے دونوں مرتبہ حبشہ کی ہجرت کی تھی جس کا بیان پہلے باب کے نمبر ۱۰ پر گذر چکا۔ اس کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے بھی ہجرت کا حکم ہونے والا ہے اور مدینہ منوّرہ میری ہجرت کی جگہ ہوگی تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے مدینہ طیّبہ کی ہجرت شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی یہ دونوں حضرات بھی مدینہ طیّبہ پہنچ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی لڑائی میں تشریف لے جانے لگے تو حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تیمارداری کے واسطے مدینہ چھوڑ گئے۔ بدر کی فتح کی خوشخبری مدینہ طیّبہ میں اس وقت پہنچی جب یہ حضرات حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کو دفن کر کے آ رہے تھے۔ اسی وجہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دفن میں شرکت نہ فرما سکے۔ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے پہلے خاوند کے یہاں رخصتی بھی نہیں ہوسکی تو اولاد کا کیا ذکر، البتہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ایک صاحبزادہ جن کا نام عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا، حبشہ میں پیدا ہوئے تھے جو اپنی والدہ کے انتقال کے بعد تک زندہ رہے اور چھ سال کی عمر میں ۴ھ میں انتقال فرمایا اور بعض نے لکھا ہے کہ اپنی والدہ سے ایک سال پہلے انتقال کیا۔ ان کے علاوہ کوئی اور اولاد حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا سے نہیں ہوئی۔

حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کے حالات

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری صاحبزادی اُم کلثوم رضی اللہ عنہا تھیں۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان میں اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا میں سے کونسی بڑی تھیں۔ اکثر کی رائے یہ ہے کہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا بڑی تھیں، اول عتیبہ بن ابی لہب سے نکاح ہوا، مگر رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ

سورۂ تبت کے نازل ہونے پر طلاق کی نوبت آئی جیسا کہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے بیان میں گذرا، لیکن اُن کے خاوند تو بعد میں مسلمان ہو گئے تھے جیسا کہ گذر چکا، اور اِن کے خاوند عتیبہ نے طلاق دی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آکر نہایت گستاخی، بے ادبی اور نامناسب الفاظ بھی زبان سے نکالے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی کہ یا اللہ! اپنے کتّوں میں سے ایک کتّا اس پر مسلّط فرما۔ ابو طالب اس وقت موجود تھے۔ باوجود مسلمان نہ ہونے کے سہم گئے اور کہا کہ اس کی بددعا سے تجھے خلاصی نہیں، چنانچہ عتیبہ ایک مرتبہ شام کے سفر میں جارہا تھا، اس کا باپ ابولہب باوجود ساری عداوت اور دشمنی کے کہنے لگا کہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کی فکر ہے۔ قافلہ کے سب لوگ ہماری خبر رکھیں۔ ایک منزل پر پہنچے، وہاں شیر زیادہ تھے۔ رات کو تمام قافلہ کا سامان ایک جگہ جمع کیا اور اس کا ٹیلہ سا بنا کر اس پر عتیبہ کو سلایا اور قافلہ کے تمام آدمی چاروں طرف سوئے۔ رات کو ایک شیر آیا اور سب کے منہ سونگھے، اس کے بعد ایک زقند لگائی اور اس ٹیلے پر پہنچ کر عتیبہ کا سر بدن سے جدا کر دیا۔ اس نے ایک آواز دی، مگر ساتھ ہی کام تمام ہو چکا تھا۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ مسلمان ہو گیا تھا اور یہ قصّہ پہلے بھائی کے ساتھ پیش آیا۔ بہر حال حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے پہلے شوہروں میں سے ایک مسلمان ہوئے، دوسرے کے ساتھ یہ عبرت کا واقعہ پیش آیا۔ اسی واسطے اللہ والوں کی دشمنی سے ڈرایا جاتا ہے۔ خود اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے[1] "مَنْ عَادٰى لِىْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" (جو میرے کسی ولی کو ستائے میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے) حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد ربیع الاول ۳ھ میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح آسمانی وحی کے حکم سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کیا۔ بعض روایات میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا دونوں کے متعلق یہی ارشاد فرمایا۔ پہلے خاوند کے یہاں تو رخصتی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اولاد کوئی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی نہیں ہوئی اور شعبان ۹ھ میں انتقال فرمایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے انتقال کے بعد ارشاد فرمایا کہ اگر میری سو لڑکیاں ہوتیں اور انتقال کرتیں تو اسی طرح ایک دوسری کے بعد سب کا نکاح عثمان رضی اللہ عنہ سے کرتا۔

---

[1] یعنی حدیثِ قدسی

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حالات

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چوتھی صاحبزادی جنتی عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا جو عمر میں اکثر مؤرخین کے نزدیک سب سے چھوٹی ہیں۔ نبوت کے ایک سال بعد جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اکتالیس برس کی تھی پیدا ہوئیں اور بعض نے نبوت سے پانچ سال پہلے پینتیس سال کی عمر میں لکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کا نام فاطمہ رضی اللہ عنہا الہام یا وحی سے رکھا گیا۔ فَطم کے معنی روکنے کے ہیں یعنی یہ جہنّم کی آگ سے محفوظ ہیں۔ ۲ھ محرم یا صفر یا رجب یا رمضان میں حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ سے نکاح ہوا اور نکاح سے سات ماہ اور پندرہ دن بعد رخصتی ہوئی۔ یہ نکاح بھی اللہ جل شانہٗ کے حکم سے ہوا۔ کہتے ہیں کہ نکاح کے وقت آپ رضی اللہ عنہا کی عمر پندرہ سال پانچ ماہ کی تھی۔ اس سے بھی اکتالیسویں سال میں پیدائش یعنی پہلے قول کی تصدیق ہوتی ہے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عمر اکیس سال پانچ ماہ یا چوبیس سال ڈیڑھ ماہ کی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تمام صاحبزادیوں میں ان سے زیادہ محبّت تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سفر کو تشریف لے جاتے تو سب سے اخیر میں ان سے رخصت ہوتے اور جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے ان کے پاس تشریف لے جاتے۔ حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ نے ابو جہل کی لڑکی سے دوسرے نکاح کا ارادہ فرمایا تو ان کو رنج ہوا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے بدن کا ٹکڑا ہے، جس نے اس کو رنج پہنچایا اس نے مجھے رنج پہنچایا، اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کی زندگی میں کوئی نکاح نہیں کیا۔ آپ کے وصال کے بعد آپ کی بھانجی امامہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا جس کا ذکر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے بیان میں گذرا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ مہینے بعد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بیمار ہوئیں اور ایک روز خادمہ سے فرمایا کہ میں غسل کروں گی، پانی رکھ دو۔ غسل فرمایا، نئے کپڑے پہنے، پھر فرمایا کہ میرا بستر ہ گھر کے بیچ میں کر دو۔ اس پر تشریف لے گئیں اور قبلہ رخ لیٹ کر داہنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھا اور فرمایا کہ بس اب میں مرتی ہوں۔ یہ فرما کر وصال فرمایا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا سلسلہ انہیں سے چلا اور ان شاء اللہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ ان کی چھ اولاد، تین لڑکے تین لڑکیاں ہوئیں۔ سب سے اوّل

حضرت حسن رضی اللہ عنہ نکاح سے دوسرے سال میں پیدا ہوئے، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ تیسرے سال میں یعنی ۴ھ میں، پھر حضرت محسّن رضی اللہ عنہ (یہ س کی تشدید کے ساتھ ہے) پیدا ہوئے جن کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا۔ صاحبزادیوں میں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا انتقال بچپن ہی میں ہوگیا تھا، اسی وجہ سے بعض مؤرخین نے ان کو لکھا بھی نہیں۔ دوسری صاحبزادی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ امیر المومنین سے ہوا جن سے ایک صاحبزادے زید رضی اللہ عنہ اور ایک صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح عون بن جعفر رضی اللہ عنہ سے ہوا، ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بھائی محمد بن جعفر رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جو بچپن ہی میں انتقال کر گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے تیسرے بھائی عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ ان سے بھی کوئی اولاد نہیں ہوئی اور انہی کے نکاح میں حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا اور اسی دن ان کے صاحبزادے زید رضی اللہ عنہ کا بھی انتقال ہوا۔ دونوں جنازے ساتھ ہی اٹھے اور کوئی سلسلہ اولاد کا ان سے نہیں چلا۔ یہ تینوں بھائی وہی عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عون رضی اللہ عنہ اور محمد رضی اللہ عنہ ہیں جن کا قصّہ چھٹے باب کے نمبر ۱۱ پر گذرا ہے۔ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھتیجے اور جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تیسری صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں جن کا نکاح عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ سے ہوا اور دو صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عون رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے اور انہیں کے نکاح میں انتقال فرمایا۔ ان کے انتقال کے بعد عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کا نکاح ان کی ہمشیرہ حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا سے ہوا تھا۔ یہ اولاد حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہے، ورنہ حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ کی دوسری بیویوں سے جو بعد میں ہوئیں اور بھی اولاد ہے۔ مؤرخین نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تمام اولاد بتیس لکھی ہے جن میں سولہ لڑکے اور سولہ لڑکیاں اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے پندرہ لڑکے، آٹھ لڑکیاں، اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے چھ لڑکے تین لڑکیاں۔ "رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ وَاَرْضَاھُمْ اَجْمَعِیْنَ وَجَعَلَنَا بِھَدْیِھِمْ مُتَّبِعِیْنَ، وَاللّٰہُ اَعْلَمُ وَعِلْمُہٗ اَتَمُّ. مُلَخَّصٌ من الخميس والزرقاني على المواهب والتلقيح والاصابة واسدالغابة.

گیارھواں باب

بچوں کا دینی جذبہ

کم سِن اور نو عمر بچوں میں جو دین کا جذبہ تھا وہ حقیقت میں بڑوں کی پرورش کا ثمرہ تھا۔ اگر ماں باپ اور دوسرے اولیاء اولاد کو شفقت میں کھو دینے اور ضائع کر دینے کے بجائے شروع ہی سے ان کی دینی حالت کی خبر گیری اور اس پر تنبیہ رکھیں تو دین کے امور بچوں کے دلوں میں جگہ پکڑیں اور بڑی عمر میں جا کر وہ چیزیں ان کے لئے بمنزلہ عادت کے ہو جائیں، لیکن ہم لوگ اس کے برخلاف بچے کی ہر بری بات پر بچہ سمجھ کر چشم پوشی کرتے ہیں، بلکہ زیادہ محبّت کا جوش ہوتا ہے تو اس پر خوش ہوتے ہیں اور دین میں جتنی کوتاہی دیکھتے ہیں اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دیتے ہیں کہ بڑے ہو کر سب درست ہو جاوے گا، حالانکہ بڑے ہو کر وہی عادات پکتی ہیں جن کا شروع میں بیج بویا جا چکا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ بیج چنے کا ڈالا جائے اور اس سے گیہوں پیدا ہو، یہ مشکل ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے میں اچھی عادتیں پیدا ہوں، دین کا اہتمام ہو، دین پر عمل کرنے والا ہو تو بچپن ہی سے اس کو دین کے اہتمام کا عادی بنائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بچپن سے ہی اپنی اولاد کی نگہداشت فرماتے تھے اور دینی امور کا اہتمام کراتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ایک شخص پکڑ کر لایا گیا جس نے رمضان میں شراب پی رکھی تھی اور روزہ سے نہیں تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ تیرا ناس ہو، ہمارے تو بچے بھی روزہ دار ہیں۔[1]

ف: یعنی تو اتنا بڑا ہو کر بھی روزہ نہیں رکھتا۔ اس کے بعد اس کے اَسّی کوڑے شراب کی سزا میں مارے اور مدینہ منورہ سے نکل جانے کا حکم فرما کر ملکِ شام کو چلتا کر دیا۔

(۱) بچوں کو روزہ رکھوانا

رُبَیّع بنت مُعَوِّذ جن کا قصّہ پہلے باب کے اخیر میں گذرا ہے کہتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] بخاری

ایک مرتبہ اعلان کرایا کہ آج عاشورہ کا دن ہے، سب کے سب روزہ رکھیں۔ ہم لوگ اس کے بعد سے ہمیشہ روزہ رکھتے رہے اور اپنے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے تھے۔ جب وہ بھوک کی وجہ سے رونے لگتے تو روئی کے گالے کے کھلونے بنا کر ان کو بہلایا کرتے تھے اور افطار کے وقت تک اسی طرح ان کو کھیل میں لگائے رکھتے تھے۔[1]

ف: بعض احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ مائیں دودھ پیتے بچوں کو دودھ نہیں پلاتی تھیں اگرچہ اس وقت قُویٰ نہایت قوی تھے اور اب بہت ضعیف، وہ لوگ اور وہ بچے اس کے مُتحمّل تھے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جتنے کا اب تحمّل ہے وہی کہاں کیا جاتا ہے۔ تحمّل کا دیکھنا تو نہایت ضروری ہے، مگر اب جس کا تحمّل ہو اس میں کوتاہی یقیناً نامناسب ہے۔

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی احادیث اور آیت کا نزول

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا چھ سال کی عمر میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ مکّہ مکرّمہ نکاح ہوا اور نویں سال کی عمر میں مدینہ طیّبہ میں رخصتی ہوئی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا۔ اٹھارہ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے جس میں اس قدر دینی مسائل اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور افعال ان سے نقل کئے جاتے ہیں کہ حد نہیں۔ مسروق رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم کو میں نے دیکھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ عطاء رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مردوں سے زیادہ مسائل سے واقف اور عالم تھیں۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جو علمی مشکل ہمیں درپیش آتی تھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس کے متعلق تحقیق ملتی تھی۔[2] دو ہزار دو سو دس حدیثیں کتبِ حدیث میں ان کی ملتی ہیں۔[3] خود فرماتی ہیں کہ میں مکّہ مکرّمہ میں بچپن میں کھیل رہی تھی اس وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ قمر کی آیت "بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ" (القمر: ۴۶) نازل ہوئی۔[4] مکّہ مکرّمہ میں آٹھ برس کی عمر تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا رہی ہیں۔ اس کم عمری میں اس آیت کے نازل ہونے کی خبر ہونا اور پھر اس کا یاد بھی رکھنا دین کے ساتھ خاص ہی لگاؤ سے ہوسکتا ہے، ورنہ آٹھ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔

---

۱ بخاری، ۲ اصابہ، ۳ تلقیح، ۴ بخاری

(۳) حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کا جہاد کی شرکت کا شوق

حضرت عمیر رضی اللہ عنہ آبی اللحم کے غلام اور کم عمر بچے تھے۔ جہاد میں شرکت کا شوق اس وقت ہر چھوٹے بڑے کی جان تھا۔ خیبر کی لڑائی میں شرکت کی خواہش کی، ان کے سرداروں نے بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں سفارش کی کہ اجازت فرما دی جائے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت فرما دی اور ایک تلوار مرحمت فرمائی جو گلے میں لٹکا لی، مگر تلوار بڑی تھی اور قد چھوٹا تھا، اس لئے وہ زمین پر گھسٹتی جاتی تھی۔ اسی حال میں خیبر کی لڑائی میں شرکت کی، چونکہ بچے بھی تھے اور غلام بھی، اس لئے غنیمت کا پورا حصّہ تو ملا نہیں، البتہ بطور عطا کے کچھ سامان حصّہ میں آیا۔[1]

ف: ان جیسے حضرات کو یہ بھی معلوم تھا کہ غنیمت میں ہمارا پورا حصّہ بھی نہیں، اس کے باوجود پھر یہ شوق کہ دوسرے حضرات سے سفارشیں کرائی جاتی تھیں۔ اس کی وجہ دینی جذبہ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے سچّے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وعدوں پر اطمینان کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

(۴) حضرت عُمیر رضی اللہ عنہ کا بدر کی لڑائی میں چھپنا

حضرت عُمیر بن ابی وقّاص رضی اللہ عنہ ایک نو عمر صحابی ہیں۔ شروع ہی میں مسلمان ہو گئے تھے، سعد بن ابی وقاص مشہور صحابی کے بھائی ہیں۔ سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی عمیر رضی اللہ عنہ کو بدر کی لڑائی کے وقت دیکھا کہ لشکر کی روانگی کی تیاری ہو رہی تھی اور وہ ادھر ادھر چھپتے پھر رہے تھے کہ کوئی دیکھے نہیں۔ مجھے یہ بات دیکھ کر تعجب ہوا، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟ کہنے لگے مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجھے نہ دیکھ لیں اور بچہ سمجھ کر جانے کی ممانعت کر دیں کہ پھر نہ جا سکوں گا اور مجھے تمنّا ہے کہ لڑائی میں ضرور شریک ہوں؟ کیا بعید ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھی کسی طرح شہادت نصیب فرمائیں، آخر جب لشکر پیش ہوا تو جو خطرہ تھا وہ پیش آیا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کم عمر ہونے کی وجہ سے انکار فرما دیا، مگر شوق کا غلبہ تھا، تحمّل نہ کر سکے اور رونے لگے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو شوق کا اور رونے کا حال معلوم ہوا تو اجازت عطا فرما دی۔ لڑائی میں

[1] ابوداؤد

شریک ہوئے اور دوسری تمنا بھی پوری ہوئی کہ اسی لڑائی میں شہید ہوئے۔ ان کے بھائی سعد رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان کے چھوٹے ہونے اور تلوار کے بڑے ہونے کی وجہ سے میں اس کے تسموں میں گرہیں لگاتا تھا کہ اونچی ہو جائے۔[1]

(۵) دو انصاری بچوں کا ابوجہل کو قتل کرنا

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مشہور اور بڑے صحابہ میں ہیں۔ فرماتے ہیں کہ میں بدر کی لڑائی میں میدان میں لڑنے والوں کی صف میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے دائیں اور بائیں جانب انصار کے دو کم عمر لڑکے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ میں اگر قوی اور مضبوط لوگوں کے درمیان ہوتا تو اچھا تھا کہ ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کر سکتے۔ میرے دونوں جانب بچے ہیں، یہ کیا مدد کر سکیں گے۔ اتنے میں ان دونوں لڑکوں میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا: چچا جان! تم ابوجہل کو بھی پہچانتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! پہچانتا ہوں۔ تمہاری کیا غرض ہے؟ اس نے کہا: مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالیاں بکتا ہے۔ اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر میں اس کو دیکھ لوں تو اس وقت تک اس سے جدا نہ ہوں گا کہ وہ مر جائے یا میں مر جاؤں۔ مجھے اس کے اس سوال اور جواب پر تعجب ہوا۔ اتنے میں دوسرے نے یہی سوال کیا اور جو پہلے نے کہا تھا وہی اس نے بھی کہا۔ اتفاقاً میدان میں ابوجہل دوڑتا ہوا مجھے نظر پڑ گیا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ تمہارا مطلوب جس کے بارہ میں تم مجھ سے سوال کر رہے تھے وہ جا رہا ہے۔ دونوں یہ سن کر تلواریں ہاتھ میں لئے ہوئے ایک دم بھاگے چلے گئے اور جا کر اس پر تلوار چلانی شروع کر دی یہاں تک کہ اس کو گرا دیا۔[2]

ف: یہ دونوں صاحبزادے مُعاذ بن عَمرو بن جَمُوح رضی اللہ عنہ اور مُعاذ بن عَفرَاء رضی اللہ عنہ ہیں۔ معاذ بن عمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں لوگوں سے سنتا تھا کہ ابوجہل کو کوئی نہیں مار سکتا، وہ بڑی حفاظت میں رہتا ہے۔ مجھے اسی وقت سے خیال تھا کہ میں اس کو ماروں گا۔ یہ دونوں صاحبزادے پیدل تھے اور ابوجہل گھوڑے پر سوار تھا۔ صفوں کو درست کر رہا تھا جس وقت

[1] اصابہ، [2] بخاری

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے دیکھا اور یہ دونوں دوڑے۔ تو گھوڑے سوار پر براہِ راست حملہ مشکل تھا اس لئے ایک نے گھوڑے پر حملہ کیا اور دوسرے نے ابوجہل کی ٹانگ پر حملہ کیا جس سے گھوڑا بھی گرا اور ابوجہل بھی گرا اور اٹھ نہ سکا۔ یہ دونوں حضرات تو اس کو ایسا کر کے چھوڑ آئے تھے کہ اٹھ نہ سکے اور وہیں پڑا تڑپتا رہے، مگر مُعوّذ بن عفراء ان کے بھائی نے اور ذرا ٹھنڈا کر دیا کہ مبادا اٹھ کر چلا جائے لیکن بالکل انہوں نے بھی نہ نمٹایا۔ اس کے بعد عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بالکل ہی سَر جُدا کر دیا۔ مُعاذ بن عَمرو رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس وقت میں نے اس کی ٹانگ پر حملہ کیا تو اس کا لڑکا عِکرِمہ ساتھ تھا۔ اس نے میرے مونڈھے پر حملہ کیا جس سے میرا ہاتھ کٹ گیا اور صرف کھال میں لٹکا ہوا رہ گیا[1] میں نے اس لٹکے ہوئے ہاتھ کو کمر کے پیچھے ڈال لیا اور دن بھر دوسرے ہاتھ سے لڑتا رہا، لیکن جب اس کے لٹکے رہنے سے دقت ہوئی تو میں نے اس کو پاؤں کے نیچے دبا کر زور سے کھینچا، وہ کھال بھی ٹوٹ گئی جس سے وہ اٹک رہا تھا اور میں نے اس کو پھینک دیا۔[2]

(۶) حضرت رافع اور ابنِ جُندُب رضی اللہ عنہما کا مقابلہ

نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب لڑائی کے لئے تشریف لے جاتے تو مدینہ مُنوّرہ سے باہر جانے کے بعد لشکر کا معائنہ فرماتے۔ ان کے حوال کو، ان کی ضرورتوں کو دیکھتے اور لشکر کی اصلاح فرماتے، کم عمر بچوں کو واپس فرما دیتے۔ یہ حضرات شوق میں نکل پڑتے، چنانچہ اُحد کی لڑائی کے لئے جب تشریف لے جانا ہوا تو ایک موقع پر جا کر لشکر کا معائنہ فرمایا اور نو عمروں کو لڑکپن کی وجہ سے واپس فرما دیا جن میں حضراتِ ذیل بھی تھے:۔ عبداللہ بن عمر، زید بن ثابت، اُسامہ بن زید، زید بن ارقم، براء بن عازب، عمرو بن حزم، اُسَید بن ظُہیر، عرابۃ بن اوس، ابوسعید خدری، سَمُرَۃ بن جُندب، رافع بن خدیج رضوان اللہ علیہم اجمعین کہ ان کی عمریں تقریباً تیرہ، چودہ برس کی تھیں، جب ان کو واپسی کا حکم ہوا تو حضرت خَدِیج رضی اللہ عنہ نے سفارش کی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرا لڑکا رافع تیر چلانا بہت اچھا جانتا ہے اور خود رافع بھی اجازت کے اشتیاق میں اُبھر اُبھر کر کھڑے ہوتے تھے کہ قد لمبا معلوم ہو،

[1] اسد الغابہ، [2] خمیس

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت عطا فرمادی تو سَمُرَۃ بن جُندب رضی اللہ عنہ نے اپنے سوتیلے باپ مُرَّۃ بن سنان سے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رافع کو تو اجازت مَرحمت فرمادی اور مجھے اجازت نہیں عطا فرمائی حالانکہ میں رافع سے قوی ہوں، اگر میرا اور اس کا مقابلہ ہو تو میں اس کو پچھاڑ لوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کا مقابلہ کرایا تو سمرہ رضی اللہ عنہ نے رافع رضی اللہ عنہ کو واقعی پچھاڑ لیا۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سمرہ رضی اللہ عنہ کو بھی اجازت عطا فرمادی۔ اس کے بعد اور بچوں نے بھی کوشش کی اور بعضوں کو اور بھی اجازت مل گئی۔ اسی سلسلے میں رات ہوگئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لشکر کی حفاظت کا انتظام فرمایا اور پچاس آدمیوں کو پورے لشکر کی حفاظت کے واسطے مُتعیّن فرمایا۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ ہماری حفاظت کون کرے گا؟ ایک صاحب اٹھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ذکوان۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا بیٹھ جاؤ۔ پھر فرمایا: ہماری حفاظ کون کرے گا؟ ایک صاحب اٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نام دریافت کیا۔ عرض کیا ابو سبع: (سبع کا باپ)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بیٹھ جاؤ۔ تیسری مرتبہ پھر ارشاد ہوا کہ ہماری حفاظت کون کرے گا؟ پھر ایک صاحب کھڑے ہوئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نام دریافت کیا: انہوں نے عرض کیا: ابن عبد القیس (عبد قیس کا بیٹا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اچھا بیٹھ جاؤ۔ اس کے تھوڑی دیر بعد ارشاد ہوا کہ تینوں آدمی آجاؤ تو ایک صاحب حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے دونوں ساتھی کہاں گئے؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! تینوں دفعہ میں ہی اٹھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی اور حفاظت کا حکم فرمایا۔ رات بھر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خیمہ کی حفاظت فرماتے رہے۔

ف: یہ شوق اور ولولے تھے ان حضرات کے کہ بچہ ہو یا بڑا ہر شخص کچھ ایسا مست تھا کہ جان دینا مستقل مقصود تھا۔ اسی وجہ سے کامیابی ان کے قدم چومتی تھی۔ رافع بن خَدِیج رضی اللہ عنہ نے بدر کی لڑائی میں بھی اپنے آپ کو پیش کیا تھا، مگر اس وقت اجازت نہ مل سکی تھی، پھر اُحد میں پیش کیا جس کا قصّہ ابھی گذرا۔ اس کے بعد سے ہر لڑائی میں شریک ہوتے رہے۔ اُحد کی لڑائی میں سینے میں ایک تیر لگا جب اس کو کھینچا گیا تو سارا نکل آیا، مگر بھال کا حصّہ اندر بدن میں رہ گیا جس نے زخم کی صورت اختیار کی اور اخیر زمانہ میں بڑھاپے کے قریب یہی زخم ہرا ہو کر

موت کا سبب بنا۔[1]

(۷) حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قرآن کی وجہ سے تقدُّم

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی عمر ہجرت کے وقت گیارہ سال کی تھی اور چھ سال کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے۔ بدر کی لڑائی میں اپنے آپ کو پیش کیا، اجازت نہ ملی۔ پھر احد کی لڑائی میں نکلے مگر واپس کر دیئے گئے جیسا کہ ابھی معلوم ہوا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ چونکہ سَمُرہ رضی اللہ عنہ اور رافع رضی اللہ عنہ دونوں کو اجازت ہو چکی تھی جیسا کہ ابھی اس سے پہلے قصّہ میں گذرا، اس لئے ان کو بھی اجازت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے ہر لڑائی میں شریک ہوتے رہے۔ تبوک کی لڑائی میں بنو مالِک کا جھنڈا حضرت عُمارہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارہ رضی اللہ عنہ سے لے کر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو دے دیا۔ عمارہ رضی اللہ عنہ کو فکر ہوا کہ شاید مجھ سے کوئی غلطی صادر ہوئی یا کوئی وجہِ ناراضی پیش آئی۔ دریافت کیا: یا رسول اللہ! میری کوئی شکایت حضور تک پہنچی ہے؟ ارشاد فرمایا: یہ بات نہیں بلکہ زید قرآن شریف تم سے زیادہ پڑھا ہوا ہے۔ قرآن نے اس کو جھنڈا اٹھانے میں مقدم کر دیا۔[2]

ف: حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول تھا کہ فضائل میں دین کے اعتبار سے ترجیح فرماتے تھے۔ یہاں اگرچہ لڑائی کا موقعہ تھا اور قرآن شریف کے زیادہ پڑھے ہوئے ہونے کو اس میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کے باوجود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی زیادتی کی وجہ سے جھنڈے کے اٹھانے میں ان کو مقدم فرمایا۔ اکثر چیزوں میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کا لحاظ فرماتے تھے، حتیٰ کہ اگر کئی آدمیوں کو کسی ضرورت سے ایک قبر میں دفن فرمانے کی نوبت آتی تو جس کا قرآن شریف زیادہ پڑھا ہوا ہوتا تھا، اس کو مقدم فرماتے تھے جیسا کہ غزوۂ اُحد میں کیا۔

---

[1] اسد الغابہ، [2] اسد الغابہ

(۸) حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے باپ کا انتقال

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں احد کی لڑائی میں پیش کیا گیا۔ تیرہ سال کی میری عمر تھی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول نہیں فرمایا۔ میرے والد نے سفارش بھی کی کہ اس کے قویٰ اچھے ہیں، ہڈیاں بھی موٹی ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نگاہ میری طرف اوپر کو اٹھاتے تھے پھر نیچے کر لیتے تھے، بالآخر کم عمر ہونے کی وجہ سے اجازت نہیں دی۔ میرے والد اس لڑائی میں شریک ہوئے اور شہید ہو گئے، کوئی مال وغیرہ کچھ نہ تھا۔ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سوال کرنے کی غرض سے حاضر ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ جو صبر مانگتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو صبر عطا فرماتے ہیں اور جو پاکبازی اللہ سے مانگتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ اس کو پاکباز بنا دیتے ہیں اور جو غِنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو غنا عطا فرماتے ہیں، میں نے یہ مضمون حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، پھر کچھ نہ مانگا، چپکے ہی واپس آ گیا۔ اس کے بعد حق تعالیٰ شانہٗ نے ان کو وہ رتبہ عطا فرمایا کہ نوعمر صحابہ رضی اللہ عنہم میں اس بڑے درجہ کا عالِم دوسرا مشکل سے ملے گا۔[۱]

ف: بچپن کی عمر اور باپ کے صدمہ کے علاوہ ضرورت کا وقت لیکن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عام نصیحت کو سن کر چپ چاپ چلے آنا اور اپنی پریشانی کا اظہار تک نہ کرنا، کیا آج کل کوئی بڑی عمر والا بھی کر سکتا ہے؟ سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کے لئے ایسے ہی لوگ چنے تھے جو اس کے اہل تھے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو خاتمہ میں آتا ہے کہ اللہ نے سارے آدمیوں میں سے میرے صحابہ کو چنا ہے۔

(۹) حضرت سَلَمہ رضی اللہ عنہ بن اَکوَع کی غابہ پر دوڑ

غابہ مدینہ طیّبہ سے چار پانچ میل پر ایک آبادی تھی۔ وہاں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اونٹ چرا کرتے تھے۔ کافروں کے ایک مجمع کے ساتھ عبدالرحمٰن فزاری نے ان کو لوٹ لیا۔ جو صاحب چراتے تھے ان کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو لے کر چل دیئے۔ یہ لٹیرے لوگ گھوڑوں

---

[۱] اصابہ، استیعاب

پر سوار تھے اور ہتھیار لگائے ہوئے تھے۔ اتفاقاً حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ صبح کے وقت پیدل تیر کمان لئے ہوئے غابہ کی طرف چلے جا رہے تھے کہ اچانک ان لٹیروں پر نگاہ پڑی، بچے تھے دوڑتے بہت تھے، کہتے ہیں کہ ان کی دوڑ ضرب المثل اور مشہور تھی۔ یہ اپنی دوڑ میں گھوڑے کو پکڑ لیتے تھے اور گھوڑا ان کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تیراندازی میں بھی مشہور تھے۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ نے مدینہ منوّرہ کی طرف منہ کر کے ایک پہاڑی پر چڑھ کر لوٹ کا اعلان کیا اور خود تیر کمان ساتھ تھی ہی، ان لٹیروں کے پیچھے دوڑ لئے، حتیٰ کہ ان کے پاس تک پہنچ گئے اور تیر مارنے شروع کئے اور اس پھرتی سے دمادم تیر برسائے کہ وہ لوگ بڑا مجمع سمجھے اور چونکہ خود تنہا تھے اور پیدل بھی تھے۔ اس لئے جب کوئی گھوڑا لوٹا کر پیچھا کرتا تو کسی درخت کی آڑ میں چھپ جاتے اور آڑ میں سے اس کے گھوڑے کے تیر مارتے جس سے وہ زخمی ہوتا اور وہ اس خیال سے واپس جاتا کہ گھوڑا اگر گیا تو میں پکڑا جاؤں گا۔ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: غرض وہ بھاگتے رہے اور میں پیچھا کرتا رہا، حتیٰ کہ جتنے اونٹ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لوٹے تھے وہ میرے پیچھے ہو گئے اور اس کے علاوہ تیس برچھے اور تیس چادریں وہ اپنی چھوڑ گئے۔

اتنے میں عیینہ بن حصن کی ایک جماعت مدد کے طور پر ان کے پاس پہنچ گئی اور ان لٹیروں کو قوت حاصل ہو گئی۔ یہ بھی ان کو معلوم ہو گیا کہ میں اکیلا ہوں۔ انہوں نے کئی آدمیوں نے مل کر میرا پیچھا کیا، میں ایک پہاڑ پر چڑھ گیا، وہ بھی چڑھ گئے۔ جب میرے قریب ہو گئے تو میں نے زور سے کہا کہ ذرا ٹھہرو، پہلے میری ایک بات سنو۔ تم مجھے جانتے بھی ہو کہ میں کون ہوں؟ انہوں نے کہا کہ بتا کون ہے۔ میں نے کہا: میں ابن الاکوع ہوں۔ اس ذات پاک کی قسم جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عزت دی، تم میں سے اگر کوئی مجھے پکڑنا چاہے تو نہیں پکڑ سکتا اور تم میں سے جس کو میں پکڑنا چاہوں وہ مجھ سے ہرگز نہیں چھوٹ سکتا۔ ان کے متعلق چونکہ عام طور سے یہ شہرت تھی کہ بہت زیادہ دوڑتے ہیں حتیٰ کہ عربی گھوڑا بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ دعویٰ کچھ عجیب نہیں تھا۔ سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں اسی طرح ان سے بات چیت کرتا رہا اور میرا مقصود یہ تھا کہ ان لوگوں کے پاس تو مدد پہنچ گئی ہے، مسلمانوں کی طرف سے میری مدد بھی آ جائے کہ میں بھی مدینہ میں اعلان کر کے آیا تھا۔

غرض ان سے اسی طرح میں بات کرتا رہا اور درختوں کے درمیان سے مدینہ مُنوّرہ کی طرف غور سے دیکھتا رہا کہ مجھے ایک جماعت گھوڑے سواروں کی دوڑ کر آتی ہوئی نظر آئی، ان میں سے سب سے آگے اَخرم اسدی رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے آتے ہی عبدالرحمٰن فزاری پر حملہ کیا اور عبدالرحمٰن بھی ان پر متوجہ ہوا۔ انہوں نے عبدالرحمٰن کے گھوڑے پر حملہ کیا اور پاؤں کاٹ دیئے۔ جس سے وہ گھوڑا گرا اور عبدالرحمٰن نے گرتے ہوئے ان پر حملہ کر دیا جس سے وہ شہید ہو گئے اور عبدالرحمٰن فوراً ان کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ان کے پیچھے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ تھے، فوراً انہوں نے حملہ شروع کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کے پاؤں پر حملہ کیا جس سے وہ گرے اور گرتے ہوئے انہوں نے عبدالرحمٰن پر حملہ کیا جس سے وہ قتل ہو گیا اور ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فوراً اس گھوڑے پر جو اخرم اسدی رضی اللہ عنہ کا تھا اور اب اس پر عبدالرحمٰن سوار ہو رہا تھا سوار ہو گئے۔[1]

ف: بعض تواریخ میں لکھا ہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے اخرم اسدی رضی اللہ عنہ کو حملہ سے روکا بھی تھا کہ ذرا ٹھہر جاؤ، اپنا مجمع اور آنے دو، مگر انہوں نے فرمایا کہ مجھے شہید ہونے دو۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں صرف یہی شہید ہوئے اور کُفّار کے بہت سے آدمی اس لڑائی میں مارے گئے۔ اس کے بعد بڑا مجمع مسلمانوں کا پہنچ گیا اور وہ لوگ بھاگ گئے تو حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ میرے ساتھ سو آدمی کر دیں میں ان کا پیچھا کروں گا، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اپنی جماعتوں میں پہنچ گئے۔ اکثر تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ کی عمر اس وقت بارہ یا تیرہ برس کی تھی۔ بارہ تیرہ برس کا لڑکا گھوڑے سواروں کی ایک بڑی جماعت کو اس طرح بھگا دے کہ ہوش و حواس گم ہو جائیں، جو لُوٹا تھا وہ بھی چھوڑ دیں اور اپنا بھی سامان چھوڑ جائیں، یہ اسی اخلاص کی برکت تھی جو اللہ جل شانہٗ نے اس جماعت کو نصیب فرمایا تھا۔

(۱۰) بدر کا مقابلہ اور حضرت براء رضی اللہ عنہ کا شوق

بدر کی لڑائی سب سے افضل اور سب سے زیادہ مُہتَمّ بالشّان لڑائی ہے اس لئے کہ اس

[1] ابوداؤد

میں مقابلہ نہایت سخت تھا۔ مسلمانوں کی جماعت نہایت قلیل، کل تین سو پندرہ آدمی تھے۔ جن کے پاس صرف تین گھوڑے چھ یا نو زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں اور ستر اونٹ تھے۔ ایک ایک اونٹ پر کئی کئی آدمی باری باری سوار ہوتے تھے اور کفار کی جماعت ایک ہزار کے قریب تھی جن میں سو گھوڑے اور سات سو اونٹ اور لڑائی کا کافی سامان تھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگ نہایت اطمینان کے ساتھ باجوں اور گانے والی عورتوں کے ساتھ میدان میں آئے۔ ادھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت متفکر کہ مسلمان نہایت کمزوری کی حالت میں تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں جماعتوں کا اندازہ فرمایا تو دعا مانگی: یا اللہ! یہ مسلمان ننگے پاؤں ہیں، تو ہی ان کو سواری دینے والا ہے۔ یہ ننگے بدن ہیں تو ہی ان کو کپڑا پہنانے والا ہے، یہ بھوکے ہیں، تو ہی ان کا پیٹ بھرنے والا ہے۔ یہ فقیر ہیں تو ہی ان کو غنی کرنے والا ہے، چنانچہ یہ دعا قبول ہوئی۔

ان سب باتوں کے باوجود حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ دونوں حضرات لڑائی میں شرکت کے شوق میں گھر سے چل دیئے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ ہونے کی وجہ سے راستہ میں لوٹا دیا۔[1] یہ دونوں حضرات احد کی لڑائی میں سے بھی واپس کیے گئے تھے جیسا کہ پہلے قصہ میں گذر چکا ہے۔ اُحد کی لڑائی بدر کی لڑائی سے ایک سال بعد ہوئی۔ جب اس میں بھی یہ بچوں میں شمار کیے گئے تو بدر میں بطریق اولیٰ بچے تھے، مگر ان حضرات کا شوق تھا کہ بچپن ہی سے یہ ولولہ اور شوق دل میں جوش مارتا تھا اور ہر لڑائی میں شریک ہونے اور اجازت ملنے کی کوشش کرتے تھے۔

(۱۱) حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن عبداللہ بن اُبَیّ کا اپنے باپ سے معاملہ

۵ ھ میں بنو المُصطَلِق کی مشہور جنگ ہوئی۔ اس میں ایک مہاجری اور ایک انصاری کی باہم لڑائی ہوگئی، معمولی بات تھی، مگر بڑھ گئی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی قوم سے دوسرے کے خلاف مدد چاہی اور دونوں طرف جماعتیں پیدا ہو گئیں اور قریب تھا کہ آپس میں لڑائی کا معرکہ گرم ہو جائے کہ درمیان میں بعض لوگوں نے پڑ کر صلح کرادی۔ عبداللہ بن اُبَیّ

[1] خمیس

منافقوں کا سردار اور نہایت مشہور منافق اور مسلمانوں کا سخت مخالف تھا، مگر چونکہ اسلام ظاہر کرتا تھا اس لئے اس کے ساتھ خلاف کا برتاؤ نہ کیا جاتا تھا اور یہی اس وقت منافقوں کے ساتھ عام برتاؤ تھا۔ اس کو جب اس قصّے کی خبر ہوئی تو اس نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ لفظ کہے اور اپنے دوستوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ تمہارا اپنا ہی کیا ہوا ہے، تم نے ان لوگوں کو اپنے شہروں میں ٹھکانا دیا۔ اپنے مالوں کو ان کے درمیان آدھوں آدھ بانٹ لیا۔ اگر تم ان لوگوں کی مدد کرنا چھوڑ دو تو اب بھی سب چلے جاویں اور یہ بھی کہا کہ خدا کی قسم! ہم لوگ اگر مدینہ پہنچ گئے تو ہم عزت والے مل کر ان ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نوعمر بچے تھے، وہاں موجود تھے یہ سن کر تاب نہ لا سکے۔ کہنے لگے کہ خدا کی قسم! تو ذلیل ہے، تو اپنی قوم میں بھی ترچھی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، تیرا کوئی حمایتی نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم عزت والے ہیں، رحمٰن کی طرف سے بھی عزت دیئے گئے ہیں اور اپنی قوم میں بھی عزت والے ہیں۔ عبداللہ بن ابی نے کہا کہ اچھا چُپکا رہ۔ میں تو ویسے ہی مذاق میں کہہ رہا تھا، مگر حضرت زید رضی اللہ عنہ نے جا کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کر دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درخواست بھی کی کہ اس کافر کی گردن اڑا دی جائے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت مرحمت نہ فرمائی۔ عبداللہ بن اُبَیّ کو جب اس کی خبر ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک یہ قصّہ پہنچ گیا ہے تو حاضرِ خدمت ہو کر جھوٹی قسمیں کھانے لگا کہ میں نے کوئی لفظ ایسا نہیں کہا، زید نے جھوٹ نقل کر دیا۔ انصار کے بھی کچھ لوگ حاضرِ خدمت تھے۔ انہوں نے بھی سفارش کی کہ یارسول اللہ! عبداللہ قوم کا سردار ہے، بڑا آدمی شمار ہوتا ہے۔ ایک بچہ کی بات اس کے مقابلہ میں قابلِ قبول نہیں، ممکن ہے کہ سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہو یا سمجھنے میں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا عذر قبول فرما لیا۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کو جب اس کی خبر ہوئی کہ اس نے جھوٹی قسموں سے اپنے آپ کو سچّا ثابت کر دیا اور زید رضی اللہ عنہ کو جھٹلا دیا تو شرم کی وجہ سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بھی ندامت کی وجہ سے حاضر نہ ہو سکے، بالآخر سورۂ منافقون نازل ہوئی جس سے حضرت زید رضی اللہ عنہ کی سچّائی اور عبداللہ بن اُبَیّ کی جھوٹی قسموں کا حال ظاہر ہوا،

حضرت زید رضی اللہ عنہ کی وُقعت موافق، مخالف سب کی نظروں میں بڑھ گئی اور عبداللہ بن اُبَیّ کا قصّہ بھی سب پر ظاہر ہو گیا۔ جب مدینہ منوّرہ قریب آیا تو عبداللہ بن اُبَیّ کے بیٹے جن کا نام بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا اور بڑے پکے مسلمانوں میں تھے۔ مدینہ منورہ سے باہر تلوار کھینچ کر کھڑے ہو گئے اور باپ سے کہنے لگے کہ اس وقت تک مدینہ منوّرہ میں داخل نہیں ہونے دوں گا جب تک اس کا اقرار نہ کرے کہ تو ذلیل ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم عزیز ہیں۔ اس کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ صاحبزادہ ہمیشہ سے باپ کے ساتھ بہت احترام اور نیکی کا برتاؤ کرنے والے تھے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں تحمّل نہ کر سکے۔ آخر اس نے مجبور ہو کر اس کا اقرار کیا کہ واللہ! میں ذلیل ہوں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم عزیز ہیں۔ اس کے بعد مدینہ میں داخل ہو سکا۔[1]

(۱۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حُمراءُ الاَسد میں شرکت

اُحد کی لڑائی سے فراغت پر مسلمان مدینہ طیّبہ پہنچے۔ سفر اور لڑائی کی تکان خوب تھی۔ مگر مدینہ مُنوّرہ پہنچتے ہی یہ اطلاع ملی کہ ابوسفیان نے لڑائی سے واپسی پر حمراءُ الاسد (ایک جگہ کا نام ہے) پہنچ کر ساتھیوں سے مشورہ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ احد کی لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی ہے، ایسے موقع کو غنیمت سمجھنا چاہئے تھا کہ نہ معلوم پھر ایسا وقت آسکے یا نہ آسکے۔ اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نَعُوذُ بِاللہ قتل کر کے لوٹنا چاہئے تھا۔ اس ارادہ سے اس نے واپسی کا مشورہ کیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ جو لوگ اُحد میں ساتھ تھے وہی صرف ساتھ ہوں اور دوبارہ حملہ کے لئے چلنا چاہئے۔ اگرچہ مسلمان اس وقت تھکے ہوئے تھے، مگر اس کے باوجود سب کے سب تیار ہو گئے۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا تھا کہ صرف وہی لوگ ساتھ چلیں جو احد میں ساتھ تھے اس لئے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ یا رسول اللہ! میری تمنّا احد میں بھی شرکت کی تھی مگر والد نے یہ کہہ کر اجازت نہ دی کہ میری سات بہنیں ہیں، کوئی مرد اور ہے نہیں۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ہم دونوں میں سے ایک کا رہنا ضروری ہے اور وہ خود جانے کا ارادہ فرما چکے تھے اس لئے مجھے اجازت نہ دی تھی۔ احد کی لڑائی میں ان کی شہادت ہو گئی۔ اب حضور مجھے اجازت مرحمت

---

[1] خمیس

فرمادیں کہ میں بھی ہمرکاب چلوں۔ حضور ﷺ نے اجازت عطا فرمادی۔ ان کے علاوہ اور کوئی ایسا شخص نہیں گیا جو احد میں شریک نہ ہو۔[1]

ف: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا اس شوق وتمنّا سے اجازت مانگنا کس قدر قابلِ رشک ہے کہ والد کا ابھی انتقال ہوا ہے۔ قرضہ بھی باپ کے ذمہ بہت سا ہے، وہ بھی یہود کا جو سختی کا برتاؤ کیا کرتے تھے اور ان کے ساتھ خاص طور سے سختی کا معاملہ کر رہے تھے۔ اس سب کے علاوہ بہنوں کے گُذران کا فکر کہ سات بہنیں بھی باپ نے چھوڑی ہیں جن کی وجہ سے ان کو احد کی لڑائی میں شرکت کی باپ نے اجازت بھی نہ دی تھی لیکن جہاد کا شوق ان سب پر غالب ہے۔

(۱۳) حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کی بہادری روم کی لڑائی میں

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ۲۶ھ میں مصر کے پہلے حاکم حضرت عَمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بجائے جب عبداللہ بن ابی سَرح رضی اللہ عنہ حاکم بنائے گئے تو وہ روم کی لڑائی کے واسطے بیس ہزار کے مجمع کے ساتھ نکلے، رومیوں کا لشکر دولاکھ کے قریب تھا، بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ رومیوں کے امیر جُرجِیر نے اعلان کیا کہ جو شخص عبداللہ بن ابی سرح کو قتل کردے گا اس سے اپنی بیٹی کا نکاح کروں گا اور ایک لاکھ دینار انعام بھی دوں گا۔ اس اعلان سے بعض مسلمانوں کو فکر ہوا، حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو علم ہوا۔ انہوں نے کہا: یہ فکر کی بات نہیں، ہماری طرف سے بھی اعلان کیا جائے کہ جو جرجیر کو قتل کرے گا اس کی بیٹی سے اس کا نکاح کیا جائے گا اور ایک لاکھ دینار انعام اور مزید یہ کہ اسی کو اِن شہروں کا امیر بھی بنادیا جائے گا۔ الغرض دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نے دیکھا کہ جرجیر سارے لشکر کے پیچھے ہے اور لشکر اس سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ دو باندیاں مور کے پروں سے اس پر سایہ کئے ہوئے ہیں، انہوں نے غفلت کی حالت میں لشکر سے ہٹ کر اس پر تنہا جاکر حملہ کیا اور وہ سمجھتا رہا کہ یہ تنہا اس طرح بڑھے آرہے ہیں، کوئی پیغامِ صلح لے کر آئے ہیں، مگر انہوں نے سیدھے پہنچ کر اس پر حملہ کردیا، اور تلوار سے سر کاٹ کر برچھے پر اٹھا کر

---

[1] خمیس

لے آئے اور سب دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

ف: حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما نو عمر ہی تھے، ہجرت کے بعد سب سے پہلی پیدائش مہاجرین میں ان ہی کی ہے۔ مسلمانوں کو ان کی پیدائش سے بہت خوشی ہوئی تھی اس لئے کہ ایک سال تک کسی مہاجری کے کوئی لڑکا نہ ہوا تھا تو یہود نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہم نے ان مہاجرین پر جادو کر رکھا ہے، ان کے لڑکا نہیں ہو سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بچوں کو بیعت فرمانے کا نہیں تھا لیکن حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کو سات برس کی عمر میں بیعت فرما لیا تھا۔ اس لڑائی کے وقت ان کی عمر چوبیس۲۴ پچیس۲۵ سال کی تھی۔ اس عمر میں دو لاکھ کے مجمع کو پھلانگ کر اس طرح سے بادشاہ کا سر کاٹ لانا معمولی چیز نہیں۔

(۱۴) حضرت عَمرو بن سَلِمَہ رضی اللہ عنہ کا کفر کی حالت میں قرآن پاک یاد کرنا

عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ مدینہ طیّبہ کے راستے میں ایک جگہ رہا کرتے تھے۔ وہاں کے آنے جانے والے ہمارے پاس سے گذرتے تھے۔ جو لوگ مدینہ مُنوّرہ سے واپس آتے ہم ان سے حالات پوچھا کرتے تھے کہ لوگوں کا کیا حال چال ہے؟ جو صاحب نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں ان کی کیا خبر ہے؟ وہ لوگ حالات بیان کرتے کہ وہ کہتے ہیں: مجھ پر وحی آتی ہے، یہ یہ آیتیں نازل ہوئیں، میں کم عمر بچہ تھا۔ وہ جو بیان کرتے میں اس کو یاد کر لیا کرتا۔ اسی طرح مسلمان ہونے سے پہلے ہی مجھے بہت سا قرآن شریف یاد ہو گیا تھا۔ عرب کے سب لوگ مسلمان ہونے کے لئے مکّہ والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ جب مکّہ مکرمہ فتح ہو گیا تو ہر جماعت اسلام میں داخل ہونے کے لئے حاضرِ خدمت ہوئی۔ میرے باپ بھی اپنی قوم کے چند آدمیوں کے ساتھ ساری قوم کی طرف سے قاصد بن کر حاضرِ خدمت ہوئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو شریعت کے احکام بتائے اور نماز سکھائی۔ جماعت کا طریقہ بتایا اور ارشاد فرمایا کہ جس کو تم میں سب سے زیادہ قرآن یاد ہو وہ امامت کے لئے افضل ہے۔ میں چونکہ آنے والوں سے آیتیں سن کر ہمیشہ یاد کر لیا کرتا تھا اس لئے سب سے زیادہ حافظِ قرآن میں ہی تھا۔ سب نے تلاش کیا، مجھ سے زیادہ حافظِ قرآن کوئی بھی قوم میں نہ نکلا

تو مجھ ہی کو انہوں نے امام بنایا۔ میری عمر اس وقت چھ سات برس کی تھی۔ جب کوئی مجمع ہوتا یا جنازہ کی نماز کی نوبت آتی تو مجھ ہی کو امام بنایا جاتا۔[۱]

ف: یہ دین کی طرف طبعی میلان اور رجحان کا اثر تھا کہ اس عمر میں بغیر مسلمان ہوئے قرآن شریف کا بہت سا حصّہ یاد کرلیا۔ رہا بچہ کی امامت کا قصّہ یہ مسئلہ کی بحث ہے، جن کے نزدیک جائز ہے ان کے نزدیک تو اشکال نہیں اور جن کے نزدیک جائز نہیں وہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی لوگوں کو ارشاد فرمایا تھا کہ تم میں جس کو قرآن زیادہ یاد ہو، بچے اس سے مراد نہیں تھے۔

(۱۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اپنے غلام کے پاؤں میں بیڑی ڈالنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے غلام حضرت عِکْرِمہ رحمۃ اللہ علیہ مشہور علماء میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے آقا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن اور حدیث اور شریعت کے احکام پڑھانے کے لئے میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی تھی کہ کہیں آؤں جاؤں نہیں۔ وہ مجھے قرآن شریف پڑھاتے اور حدیث شریف پڑھاتے۔[۲]

ف: حقیقت میں پڑھنا اسی صورت سے ہوسکتا ہے۔ جو لوگ پڑھنے کے زمانہ میں سیر وسفر اور بازار کی تفریح کے شوق میں رہتے ہیں وہ بیکار اپنی عمر ضائع کرتے ہیں۔ اسی چیز کا اثر تھا کہ پھر عکرمہ غلام، حضرت عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ بن گئے کہ ''بَحرُ الاُمّۃ'' اور ''حِبرُ الامّۃ'' کے القاب سے یاد کئے جانے لگے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تمام تابعین میں زیادہ عالم چار ہیں، جن میں سے ایک عکرمہ رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

(۱۶) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا بچپن میں حفظِ قرآن

خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھ سے تفسیر پوچھو، میں نے بچپن میں قرآن شریف حفظ کیا ہے۔ دوسری حدیث میں ہے کہ میں نے دس برس کی عمر میں اخیر کی منزل پڑھ لی تھی۔[۳]

---

[۱] بخاری، ابوداؤد، [۲] بخاری، ابن سعد، [۳] بخاری وفتح

ف: اس زمانہ کا پڑھنا ایسا نہیں تھا جیسا کہ اس زمانہ میں ہم لوگ غیر زبان والوں کا، بلکہ جو کچھ پڑھتے تھے وہ مع تفسیر کے پڑھتے تھے۔ اسی واسطے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما تفسیر کے بہت بڑے امام ہیں کہ بچپن کا یاد کیا ہوا بہت محفوظ ہوتا ہے۔ چنانچہ تفسیر کی حدیثیں جتنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل ہیں، بہت کم دوسرے حضرات سے اتنی نقل ہوں گی۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ قرآن کے بہترین مفسّر ابن عباس رضی اللہ عنہما ہیں۔ ابوعبدالرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ہم کو قرآن شریف پڑھاتے تھے وہ کہتے تھے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دس آیتیں قرآن کی سیکھتے تھے، اس کے بعد دوسری دس آیتیں اس وقت تک نہیں سیکھتے تھے، جب تک پہلی دس آیتوں کے موافق علم اور عمل نہیں ہو جاتا تھا۔[1] تیرہ ۱۳ سال کی عمر تھی جس وقت کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا۔ اس عمر میں جو درجہ تفسیر و حدیث میں حاصل کیا وہ کھلی کرامت اور قابلِ رشک ہے کہ امام تفسیر ہیں اور بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم تفسیر ان سے دریافت کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی دعا کا ثمرہ تھا کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم استنجے کے لئے تشریف لے گئے، باہر تشریف لائے تو لوٹا بھرا ہوا رکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: یہ کس نے رکھا ہے؟ عرض کیا گیا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خدمت پسند آئی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دین کا فہم اور کتاب اللہ کی سمجھ عطا فرمائیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نوافل پڑھ رہے تھے، یہ بھی نیت باندھ کر پیچھے کھڑے ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے کھینچ کر برابر کھڑا کر لیا کہ ایک مقتدی اگر ہو تو اس کو برابر کھڑا ہونا چاہئے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو نماز میں مشغول ہو گئے، یہ ذرا سا پیچھے کو ہٹ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بعد دریافت فرمایا: عرض کیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، آپ کے برابر کس طرح کھڑا ہو سکتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم و فہم کے زیادہ ہونے کی دعا دی۔[2]

(۱۷) حضرت عبداللہ بن عَمرِو بنِ العاص رضی اللہ عنہ کا حفظِ حدیث

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ان عابد اور زاہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں تھے کہ

---

[1] منتخب کنز، [2] اصابہ

روزانہ ایک کلامِ مجید ختم کرتے اور رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے اور دن کو ہمیشہ روزہ دار رہتے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کثیر محنت پر تنبیہ بھی فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ایسی صورت میں بدن ضعیف ہو جائے گا، آنکھیں رات بھر جاگنے سے پتھرا جائیں گی، بدن کا بھی حق ہے، اہل وعیال کا بھی حق ہے، آنے جانے والوں کا بھی حق ہے۔ کہتے ہیں میرا معمول تھا کہ روزانہ ایک ختم کرتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک مہینے میں ایک قرآن پڑھا کرو۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اپنی قوت اور جوانی سے مُنتفع ہونے کی اجازت فرما دیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا بیس روز میں ایک ختم کر لیا کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! بہت کم ہے۔ مجھے اپنی جوانی اور قوت سے مُتمتّع ہونے کی اجازت دیجئے۔ غرض اسی طرح عرض کرتا رہا۔ اخیر میں تین دن میں ایک ختم کی اجازت ہوئی۔ ان کا معمول تھا کہ نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو تحریر کیا کرتے تھے تاکہ یاد رہیں، چنانچہ ان کے پاس ایک مجموعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا لکھا ہوا تھا جس کا نام انہوں نے "صادقہ" رکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتا اس کو لکھ لیا کرتا تاکہ یاد رہے۔ مجھے لوگوں نے منع کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہرحال آدمی ہیں، کبھی غصّہ اور ناراضی میں کسی کو کچھ فرماتے ہیں، کبھی خوشی اور مزاح میں کچھ ارشاد ہوتا ہے، ہر بات نہ لکھا کرو۔ میں نے چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے اس کا ذکر کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لکھا کرو۔ اس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اس منہ سے غصّہ میں یا خوشی میں حق کے سوا کوئی بات نہیں نکلتی۔[1]

ف: حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ باوجود اس قدر زاہد عابد ہونے کے کہ کثرتِ عبادت میں ممتاز شمار کئے جاتے ہیں۔ پھر بھی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ روایت کرنے والا کوئی نہیں بجز عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے کہ وہ لکھتے تھے، میں لکھتا نہیں تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی روایات ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی بہت زیادہ ہیں، اگرچہ ہمارے زمانے میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات ان سے کہیں زیادہ ملتی ہیں جس کی بہت سی وجوہ ہیں، لیکن اس زمانہ میں اتنی عبادت پر بھی کثرت سے ان کی احادیث موجود تھیں۔

[1] مسند احمد، ابن سعد

(۱۸) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا حفظِ قرآن

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہیں جو اپنے زمانے میں بڑے عالم اور بڑے مفتی شمار ہوتے تھے، بالخصوص فرائض کے ماہر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مدینہ منوّرہ میں فتویٰ، قضا، فرائض، قرأت میں ان کا شمار چوٹی کے لوگوں میں تھا۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ منوّرہ تشریف لائے تو اس وقت کم عمر بچے تھے۔ گیارہ برس کی عمر تھی، اسی وجہ سے باوجود خواہش کے ابتدائی لڑائیوں، یعنی بدر وغیرہ میں شرکت کی اجازت نہیں ہوئی۔ ہجرت سے پانچ برس پہلے چھ سال کی عمر میں یتیم بھی ہو گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کے لئے مدینہ منوّرہ پہنچے تو جیسے اور لوگ حاضرِ خدمت ہو رہے تھے اور حصول برکت کے واسطے بچوں کو بھی ساتھ لا رہے تھے، زید رضی اللہ عنہ بھی خدمت میں حاضر کئے گئے۔ زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب پیش کیا گیا تو عرض کیا گیا کہ یہ قبیلۂ نجّار کا ایک لڑکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل ہی اس نے سترہ سورتیں قرآن پاک کی حفظ کر لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امتحان کے طور پر مجھے پڑھنے کو ارشاد فرمایا۔ میں نے سورۂ قٓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا پڑھنا پسند آیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خطوط یہود کے پاس بھیجنا ہوتے تھے وہ یہود ہی لکھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہود کی جو خط و کتابت ہوتی ہے اس پر مجھ کو اطمینان نہیں کہ گڑبڑ نہ کر دیتے ہوں۔ تُو یہود کی زبان سیکھ لے۔ زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں صرف پندرہ دن میں ان کی زبان عبرانی میں کامل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جو تحریر ان کو جاتی وہ میں ہی لکھتا اور جو تحریر یہود کے پاس سے آتی وہ میں ہی پڑھتا۔ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے بعض لوگوں کو سُریانی[۱] زبان میں خطوط لکھنا پڑتے ہیں اس لئے مجھ کو سریانی زبان سیکھنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی تھی۔[۲]

---

۱ ملکِ شام کی ایک قدیم زبان، ۲ فتح، اصابہ

(۱۹) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا بچپن میں علمی مشغلہ

سیّدُ السادات حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش جمہور کے قول کے موافق رمضان ۳ھ میں ہے، اس اعتبار سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت ان کی عمر سات برس اور کچھ مہینوں کی ہوئی۔ سات برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے جس میں کوئی علمی کمال حاصل کیا جا سکتا ہو، لیکن اس کے باوجود حدیث کی کئی روایتیں ان سے نقل کی جاتی ہیں۔ ابوالحَوراء رحمۃ اللہ علیہ ایک شخص ہیں، انہوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ تمہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات یاد ہے؟ انہوں نے فرمایا: ہاں! میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ راستہ میں صدقہ کی کھجوروں کا ایک ڈھیر لگ رہا تھا، میں نے اس میں سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کخ کخ (ہاہا) فرمایا اور میرے منہ سے نکال دی اور یہ ارشاد فرمایا کہ ہم صدقہ کا مال نہیں کھاتے اور میں نے پانچوں نمازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سمجھی ہیں[1] حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے وتر میں پڑھنے کے لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا بتائی تھی:

"اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ فِيْمَنْ هَدَيْتَ، وَعَافِنِيْ فِيْمَنْ عَافَيْتَ، وَ تَوَلَّنِيْ فِيْمَنْ تَوَلَّيْتَ، وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا اَعْطَيْتَ ، وَقِنِيْ شَرَّ مَاقَضَيْتَ فَاِنَّكَ تَقْضِيْ وَلَا يُقْضٰى عَلَيْكَ، اِنَّهٗ لَا يَذِلُّ مَنْ وَّالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا! وَتَعَالَيْتَ"

ترجمہ: اے اللہ! تو مجھے ہدایت فرما منجملہ ان کے جن کو تو نے ہدایت فرمائی اور مجھے عافیت عطا فرما ان لوگوں کے ذیل میں جن کو تو نے عافیت بخشی اور تو میرے کاموں کا مُتَوَلّی بن جا، جہاں اور بہت سے لوگوں کا مُتَوَلّی ہے اور جو کچھ تو نے مجھے عطا فرمایا اس میں برکت عطا فرما اور جو کچھ تو نے مقدّر فرمایا ہے اس کی برائی سے مجھے بچا کہ تو تو جو چاہے طے فرما سکتا ہے۔ تیرے خلاف کوئی شخص کوئی بھی فیصلہ نہیں کر سکتا اور جس کا تو والی ہے وہ کبھی ذلیل نہیں ہو سکتا۔ تیری ذات بابرکت ہے اور سب سے بلند ہے۔

---

[1] مسند احمد

امام حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ جو شخص صبح کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک اسی جگہ بیٹھا رہے وہ جہنّم کی آگ سے نجات پائے گا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے کئی حج پیدل کئے اور ارشاد فرماتے تھے کہ مجھے اس سے شرم آتی ہے کہ مرنے کے بعد اللہ سے ملوں اور اس کے گھر پاؤں چل کر نہ گیا ہوں۔ نہایت حلیم مزاج تھے اور پرہیزگار۔ مسندِ احمد میں متعدد روایات ان سے نقل کی گئی ہیں اور صاحب تلقیح نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا ذکر کیا ہے جن سے تیرہ حدیثیں روایت کی جاتی ہیں۔ سات برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ اس وقت کی اتنی احادیث کا یاد رکھنا اور نقل کرنا حافظہ کا کمال ہے اور شوق کی انتہا۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ اپنے بچوں کو سات برس تک دین کی معمولی سی باتیں بھی نہیں بتاتے۔

(۲۰) حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا بچپن میں علمی مشغلہ

سیّدُ السادات حضرت حسین رضی اللہ عنہ اپنے بھائی حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے بھی ایک سال چھوٹے تھے، اس لئے ان کی عمر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت اور بھی کم تھی یعنی چھ برس اور چند مہینے کی تھی۔ چھ برس کا بچہ کیا دین کی باتوں کو محفوظ کر سکتا ہے، لیکن امام حسین رضی اللہ عنہ کی روایتیں حدیث کی کتابوں میں نقل کی جاتی ہیں اور محدثین نے اس جماعت میں ان کا شمار کیا ہے جن سے آٹھ حدیثیں منقول ہیں۔ امام حسین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ کوئی مسلمان مرد ہو یا عورت اس کو کوئی مصیبت پہنچی ہو پھر وہ عرصہ کے بعد یاد آئے اور یاد آنے پر پھر وہ "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" پڑھے تو اس کو اس وقت بھی اتنا ہی ثواب پہنچے گا جتنا کہ مصیبت کے وقت پہنچا تھا۔ یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میری امت جب دریا پر سوار ہو اور سوار ہوتے وقت "بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" ﴿ (ھود: ۴۱) پڑھے تو یہ ڈوبنے سے امن کا ذریعہ ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے پچیس ۲۵ حج پیدل کئے ہیں، نماز اور روزہ کی بھی بہت کثرت فرماتے تھے اور صدقہ اور دین کے ہر کام میں کثرت کا اہتمام تھا۔ ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات آپ کو یاد ہے؟ انہوں

نے فرمایا: ہاں! میں ایک کھڑکی پر چڑھا جس میں کھجوریں رکھی تھیں۔ اس میں سے ایک کھجور میں نے منہ میں رکھ لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو پھینک دو، ہم کو صدقہ جائز نہیں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی منقول ہے کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ بیکار کاموں میں مشغول نہ ہو[1]۔ ان کے علاوہ اور بھی مُتعدِّد روایات آپ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں۔

ف: اس قسم کے واقعات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بکثرت ہیں کہ بچپن کے واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کئے اور یاد رکھے۔ محمود بن الربیع رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں جن کی عمر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت پانچ برس کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عمر بھر اس بات کو نہیں بھولوں گا کہ نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے، ہمارے یہاں ایک کنواں تھا، اس کے پانی سے ایک کلی میرے منہ پر کی[2]۔ ہم لوگ بچوں کو واہی تباہی فضول باتوں میں لگاتے ہیں، جھوٹے جھوٹے قصّے ان کو سنا کر لغویات میں دماغ کو پریشان کرتے ہیں۔ اگر اللہ والوں کے قصّے تلاش کر کے ان کو سنائے جائیں اور بجائے جن بھوت سے ڈرانے کے اللہ سے اور اس کے عذاب سے ڈرائیں اور اللہ کی ناراضی کی اَہمیّت اور ہیبت دل میں پیدا کریں تو دنیا میں بھی ان کے کارآمد ہو اور آخرت میں تو مفید ہے ہی، بچپن کا زمانہ حافظہ کی قوت کا زمانہ ہوتا ہے، اس وقت کا یاد کیا ہوا کبھی بھی نہیں بھولتا۔ ایسے وقت میں اگر قرآنِ پاک حفظ کرا دیا جائے تو نہ کوئی دِقّت ہو، نہ وقت خرچ ہو۔

میں نے اپنے والد صاحب نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ سے بھی بارہا سنا اور اپنے گھر کی بوڑھیوں سے بھی سنا ہے کہ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب دودھ چھڑایا گیا ہے تو پاؤ پارہ حفظ ہو چکا تھا اور ساتویں برس کی عمر میں قرآن شریف پورا حفظ ہو چکا تھا اور وہ اپنے والد یعنی میرے دادے صاحب سے مَخفی فارسی کا بھی مُعْتَدبہٖ حصّہ بوستان، سکندر نامہ وغیرہ پڑھ چکے تھے۔ فرمایا کرتے کہ میرے والد صاحب نے قرآن شریف ختم ہونے کے بعد یہ ارشاد فرما دیا تھا کہ ایک قرآن شریف روزانہ پڑھ لیا کرو، باقی تمام دن چھٹی۔ میں گرمی کے موسم میں صبح کی نماز کے بعد مکان کی چھت پر بیٹھا کرتا تھا اور چھ سات گھنٹہ میں قرآن شریف پورا کر کے

[1] اسد الغابہ، استیعاب، [2] اصابہ

دو پہر کو روٹی کھاتا تھا اور شام کو اپنی خوشی سے فارسی پڑھا کرتا تھا۔ چھ ماہ تک مسلسل یہی معمول رہا، چھ ماہ تک روزانہ ایک کلامِ مجید پڑھنا، پھر اس کے ساتھ ہی دوسرے اسباق بھی پڑھتے رہنا اور وہ بھی سات برس کی عمر میں کوئی معمولی بات نہیں۔ اسی کا یہ ثمرہ تھا کہ قرآن شریف میں متشابہ لگنا یا بھولنا جانتے ہی نہ تھے۔ چونکہ ظاہری معاش کتابوں کی تجارت پر تھی اور کتب خانہ کا اکثر کام اپنے ہاتھ سے کیا کرتے تھے، اس لئے ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا کہ ہاتھ سے کام کرتے وقت زبان سے تلاوت نہ فرماتے رہتے ہوں اور کبھی کبھی اسی کے ساتھ ہم لوگوں کو جو مدرسہ سے الگ پڑھتے تھے اسباق بھی پڑھا دیا کرتے تھے، اس طرح تین کام ایک وقت میں کر لیا کرتے تھے۔ مگر ان کا طریقۂ تعلیم ہم لوگوں کے ساتھ وہ نہیں تھا جو مدرسہ کے اسباق کا تھا اور عام مدارس کا مُروّجہ طریقہ ہے کہ سارا بوجھ استاد ہی کے ذمہ رہے، بلکہ مخصوص طلبہ کے ساتھ یہ طریقہ تھا کہ شاگرد عبارت پڑھے، ترجمہ کرے، مطلب بیان کرے۔ اگر وہ مطلب صحیح ہوتا ہے، تو آگے چلو فرما دیتے اور غلط ہوتا تو اگر غلطی قابلِ تنبیہ ہوتی تو تنبیہ فرماتے اور بتانے کے قابل ہوتی تو بتا دیتے۔ یہ پرانے زمانے کا قصّہ نہیں ہے۔ اسی صدی کا واقعہ ہے، لہٰذا یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جیسے قویٰ اور ہمتیں اب کہاں سے لائی جائیں۔

بارھواں باب

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ محبّت کے واقعات

اگرچہ جتنے قصّے اب تک نقل کیے گئے ہیں وہ سب ہی محبّت کے کرشمے تھے کہ محبّت ہی ان حضرات کی والہانہ زندگی کا سبب تھی جس کی وجہ سے نہ جان کی پرواہ تھی نہ زندگی کی تمنّا، نہ مال کا خیال تھا نہ تکلیف کا خوف نہ موت سے ڈر۔ اس کے علاوہ محبّت حکایت کی چیز بھی نہیں، وہ ایک کَیفیّت ہے جو الفاظ و عبارات سے بالاتر ہے۔ محبّت ہی ایک ایسی چیز ہے جو دل میں بس جانے کے بعد محبوب کو ہر چیز پر غالب کر دیتی ہے، نہ اس کے سامنے ننگ و ناموس کوئی چیز ہے نہ عزت و شرافت کوئی شے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے لطف سے اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے اپنی اور اپنے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت عطا فرمائیں تو ہر

عبادت میں لذت ہے اور دین کی ہر تکلیف میں راحت۔

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اعلانِ اسلام اور تکلیف

ابتدائے اسلام میں جو شخص مسلمان ہوتا تھا وہ اپنے اسلام کو حتّی الوسع مخفی رکھتا تھا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی اس وجہ سے کہ ان کو کفار سے اذیت نہ پہنچے، اخفاء کی تلقین ہوتی تھی۔ جب مسلمانوں کی تعداد انتالیس ۳۹ تک پہنچی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اظہار کی درخواست کی کہ کھلم کھلا علی الاعلان تبلیغ کی جائے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اول انکار فرمایا، مگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اصرار پر قبول فرمالیا اور ان سب حضرات کو ساتھ لے کر مسجدِ کعبہ میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تبلیغی خطبہ شروع کیا۔ یہ سب سے پہلا خطبہ ہے جو اسلام میں پڑھا گیا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا سیّد الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اسی دن اسلام لائے ہیں اور اس کے تین دن بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرّف باسلام ہوئے ہیں۔ خطبہ کا شروع ہونا تھا کہ چاروں طرف سے کفّار و مشرکین مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔

حضرتِ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی باوجودیکہ مکّہ مکرّمہ میں ان کی عام طور سے عظمت و شرافت مُسلّم تھی اس قدر مارا کہ تمام چہرۂ مبارک خون سے بھر گیا۔ ناک، کان سب لہولہان ہوگئے تھے، پہچانے نہ جاتے تھے، جوتوں سے لاتوں سے مارا، پاؤں میں روندا اور جو نہ کرنا تھا سب ہی کچھ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بے ہوش ہوگئے۔ بنوتَیم یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبیلے کے لوگوں کو خبر ہوئی، وہ وہاں سے اٹھا کر لائے، کسی کو بھی اس میں تردُّد نہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس وحشیانہ حملے سے زندہ نہ بچ سکیں گے۔ بنوتیم مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اگر اس حادثہ میں وفات ہوگئی تو ہم لوگ ان کے بدلہ میں عُتبہ بن رَبیعہ کو قتل کریں گے۔ عتبہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مارنے میں بہت زیادہ بدبختی کا اظہار کیا تھا۔ شام تک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بیہوشی رہی۔ باوجود آوازیں دینے کے بولنے یا بات کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ شام کو آوازیں دینے پر وہ بولے تو سب سے پہلے لفظ یہ تھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے اس پر

بہت ملامت کی کہ انہی کے ساتھ کی بدولت یہ مصیبت آئی اور دن بھر موت کے منہ میں رہنے پر بات کی تو وہ بھی حضور ﷺ ہی کا جذبہ اور ان ہی کی لے۔ لوگ پاس سے اٹھ کر چلے گئے کہ بددلی بھی تھی اور یہ بھی کہ آخر کچھ جان باقی ہے کہ بولنے کی نوبت آئی اور آپ کی والدہ اُمّ خیر سے کہہ گئے کہ ان کے کھانے پینے کے لئے کسی چیز کا انتظام کردیں۔ وہ کچھ تیار کر کے لائیں اور کھانے پر اصرار کیا، مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وہی ایک صدا تھی کہ حضور ﷺ کا کیا حال ہے، حضور ﷺ پر کیا گذری۔ ان کی والدہ نے فرمایا کہ مجھے تو خبر نہیں کہ کیا حال ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اُمِّ جمیل (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن) کے پاس جا کر دریافت کرلو کہ کیا حال ہے۔ وہ بیچاری بیٹے کی اس مظلومانہ حالت کی بے تابانہ درخواست کو پورا کرنے کے واسطے اُمِّ جمیل رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں اور محمد ﷺ کا حال دریافت کیا۔ وہ بھی عام دستور کے موافق اس وقت تک اپنے اسلام کو چھپائے ہوئے تھیں۔ فرمانے لگیں میں کیا جانوں کون محمد ﷺ اور کون ابوبکر، تیرے بیٹے کی حالت سن کر رنج ہوا اگر تو کہے تو میں چل کر اس کی حالت دیکھوں۔ ام خیر نے قبول کرلیا۔ ان کے ساتھ گئیں اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حالت دیکھ کر تحمّل نہ کرسکیں، بے تحاشا رونا شروع کردیا کہ بدکرداروں نے کیا حال کردیا، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے کئے کی سزا دے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے پھر پوچھا کہ حضور ﷺ کا کیا حال ہے۔ اُمِّ جمیل رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی والدہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ سن رہی ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ان سے خوف نہ کرو، تو امِ جمیل رضی اللہ عنہا نے خیریت سنائی اور عرض کیا کہ بالکل صحیح سالم ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ اس وقت کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف رکھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو خدا کی قسم ہے کہ اس وقت تک کوئی چیز نہ کھاؤں گا، نہ پیوں گا جب تک حضور ﷺ کی زیارت نہ کرلوں۔ ان کی والدہ کو تو بے قراری تھی کہ وہ کچھ کھالیں اور انہوں نے قسم کھالی کہ جب تک زیارت نہ کرلوں کچھ نہ کھاؤں گا، اس لئے والدہ نے اس کا انتظار کیا کہ لوگوں کی آمد ورفت بند ہو جائے۔ مبادا کوئی دیکھ لے اور کچھ اذیت پہنچائے۔ جب رات کا بہت سا حصّہ گذر گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو لے کر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی لپٹ کر روئے اور مسلمان بھی سب رونے لگے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے درخواست کی کہ یہ میری والدہ ہیں۔ آپ ان کے لئے ہدایت کی دعا بھی فرمادیں اور ان کو اسلام کی تبلیغ بھی فرمائیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اول دعا فرمائی۔ اس کے بعد ان کو اسلام کی ترغیب دی، وہ بھی اسی وقت مسلمان ہوگئیں۔[1]

ف: عیش وعشرت، نشاط وفرحت کے وقت محبت کے دعوے کرنے والے سینکڑوں ہوتے ہیں۔ محبّت وعشق وہی ہے جو مصیبت اور تکلیف کے وقت بھی باقی رہے۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال پر رنج

حضرت عمر رضی اللہ عنہ باوجود اپنی اس ضربُ المَثل قوّت، شجاعت، دلیری اور بہادری کے جو آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی شہرۂ آفاق ہے اور باوجودیکہ اسلام کا ظہور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے ہی سے ہوا کہ اسلام لانے کے بعد اپنے اسلام کا اخفا گوارا نہ ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبّت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ یہ ہے کہ اپنی اس بہادری کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی حالت کا تحمّل نہ فرماسکے۔ سخت حیرانی اور پریشانی کی حالت میں تلوار ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوگئے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا ہے تو اس کی گردن اڑادوں گا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبیّنا علیہ الصلوٰۃ والسلام طور پر تشریف لے گئے تھے۔ عنقریب حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی جھوٹی خبر اڑا رہے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بالکل گم سم تھے کہ دوسرے دن تک بالکل آواز نہیں نکلی، چلتے پھرتے تھے، مگر بولا نہیں جاتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، چپ چاپ بیٹھے رہ گئے کہ حرکت بھی بدن کو نہ ہوتی تھی۔ صرف ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا دَم تھا کہ اس وقت کے پہاڑ جیسے وقت کو برداشت کیا اور اپنی اس محبّت کے باوجود جو پہلے

[1] خمیس

قصہ میں گذری۔ اس وقت نہایت سکون سے تشریف لا کر اوّل حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا اور باہر تشریف لا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ارشاد فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد خطبہ پڑھا جس کا حاصل یہ تھا کہ جو شخص محمد کی پرستش کرتا ہو وہ جان لے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا، لیکن جو شخص اللہ کی پرستش کرتا ہو وہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ زندہ ہیں اور ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اس کے بعد کلامِ پاک کی آیت "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ" (آل عمران:۱۴۴) اخیر تک تلاوت فرمائی۔[۱] ترجمہ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نرے رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں جس پر موت وغیرہ نہ آسکے) سو اگر آپ کا انتقال ہو جاوے یا آپ شہید بھی ہو جاویں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر جائے گا تو خدا تعالیٰ کا تو کوئی نقصان نہیں کرے گا (اپنا ہی کچھ کھووے گا) اور خدا تعالیٰ شانہٗ جلد ہی جزا دے گا حق شناس لوگوں کو۔[۲]

ف: چونکہ اللہ جل شانہٗ کو حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ سے خلافت کا اہم کام لینا تھا اس لئے ان کی شایانِ شان اس وقت یہی حالت تھی۔ اسی وجہ سے اس وقت جس قدر استقلال اور تحمّل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں تھا کسی میں بھی نہ تھا اور اس کے ساتھ ہی جس قدر مسائل دفن و میراث وغیرہ کے اس وقت کے مناسب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو معلوم تھے مجموعی طور پر کسی کو بھی معلوم نہ تھے۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن میں اختلاف ہوا کہ مکّہ مکرّمہ میں دفن کیا جائے یا مدینہ منوّرہ میں یا بیت المقدّس میں تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ نبی کی قبر اسی جگہ ہوتی ہے جہاں اس کی وفات ہو۔ لہٰذا جس جگہ وفات ہوئی ہے اسی جگہ قبر کھودی جائے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ہم لوگوں (یعنی انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے جو شخص مسلمانوں کی حکومت کا مُتولّی بنے اور وہ لاپرواہی سے کوتاہی کرتے ہوئے کسی دوسرے کو امیر بنائے اس پر لعنت ہے۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قریش اس امر یعنی سلطنت کے مُتولّی ہیں وغیرہ وغیرہ۔

---

[۱] خمیس، [۲] بیان القرآن

(۳) ایک عورت کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر کیلئے بے قرار ہونا

اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو اذیت بھی بہت پہنچی اور شہید بھی بہت ہوئے۔ مدینہ طیّبہ میں یہ وحشت اثر خبر پہنچی تو عورتیں پریشان ہو کر تحقیقِ حال کے لئے گھر سے نکل پڑیں۔ ایک انصاری عورت نے مجمع کو دیکھا تو بے تابانہ پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ اس مجمع میں سے کسی نے کہا کہ تمہارے والد کا انتقال ہو گیا، انہوں نے اِنَّا لِلّٰہِ پڑھی اور پھر بے قراری سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت دریافت کی۔ اتنے میں کسی نے خاوند کے انتقال کی خبر سنائی اور کسی نے بیٹے کی اور کسی نے بھائی کی کہ یہ سب ہی شہید ہو گئے تھے۔ مگر انہوں نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیسے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بخیریت ہیں، تشریف لا رہے ہیں۔ اس سے اطمینان نہ ہوا، کہنے لگیں کہ مجھے بتا دو، کہاں ہیں؟ لوگوں نے اشارہ کر کے بتایا کہ اس مجمع میں ہیں۔ یہ دوڑی ہوئی گئیں اور اپنی آنکھوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ٹھنڈا کر کے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی زیارت ہو جانے کے بعد ہر مصیبت ہلکی اور معمولی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا پکڑ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، جب آپ زندہ و سلامت ہیں تو مجھے کسی کی ہلاکت کی پرواہ نہیں [1]

ف: اس قسم کے مُتعَدّد قصّے اس موقع پر پیش آئے ہیں، اسی وجہ سے مؤرخین میں ناموں میں اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس نوع کا واقعہ کئی عورتوں کو پیش آیا ہے۔

(۴) حُدَیبیہ میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ اور مغیرہ رضی اللہ عنہ کا فعل اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

حُدَیبیہ کی مشہور لڑائی ذیقعدہ ۶ھ میں ہوئی جب کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ عمرہ کے ارادہ سے تشریف لا رہے تھے۔ کفّارِ مکّہ کو جب اس کی خبر پہنچی تو انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ مسلمانوں کو مکّہ آنے سے روکا

---

[1] خمیس

جائے۔ اس کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر تیاری کی اور مکّہ کے علاوہ باہر کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شرکت کی دعوت دی اور بڑے مجمع کے ساتھ مقابلہ کی تیاری کی۔ ذُوالحُلیفہ سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو حالات کی خبر لانے کے لئے بھیجا جو مکّہ سے حالات کی تحقیق کر کے ''عُسفان'' پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ انہوں نے عرض کیا کہ مکّہ والوں نے مقابلہ کی بہت بڑے پیمانہ پر تیاری کر رکھی ہے اور باہر سے بھی بہت سے لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلا رکھا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے۔ ایک صورت یہ ہے کہ جو لوگ باہر سے مدد کو گئے ہیں ان کے گھروں پر حملہ کیا جائے، جب وہ خبر سنیں گے تو مکّہ سے واپس آ جائیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سیدھے چلے چلیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اس وقت آپ بیت اللہ کے ارادہ سے تشریف لائے ہیں، لڑائی کا ارادہ تو تھا ہی نہیں، اس لئے آگے بڑھے چلیں اگر وہ ہمیں روکیں گے تو مقابلہ کریں گے، ورنہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول فرمایا اور آگے بڑھے۔ حُدَیبیہ میں پہنچ کر بُدَیل بن ورقا خُزاعی ایک جماعت کو ساتھ لے کر آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا کہ کُفّار آپ کو ہرگز مکّہ میں داخل نہ ہونے دیں گے، وہ تو لڑائی پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم لوگ لڑنے کے واسطے نہیں آئے ہیں، ہمارا مقصد صرف عمرہ کرنا ہے اور قریش کو روزمرہ کی لڑائی نے بہت نقصان پہنچا رکھا ہے، بالکل ہلاک کر دیا ہے، اگر وہ راضی ہوں تو میں ان سے مصالحت کرنے کو تیار ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان اس پر معاہدہ ہو جائے کہ مجھ سے تعرّض نہ کریں، میں ان سے تعرّض نہ کروں، مجھے اوروں سے نمٹنے دیں۔ اور اگر وہ کسی چیز پر بھی راضی نہ ہوں تو اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ میں اس وقت تک ان سے لڑوں گا جب تک کہ اسلام غالب ہو جائے یا میری گردن جدا ہو جائے۔ بدیل نے عرض کیا: اچھا! میں آپ کا پیام ان تک پہنچائے دیتا ہوں۔ وہ لوٹے اور جا کر پیام پہنچایا مگر کُفّار راضی نہ ہوئے۔ اسی طرح طرفین سے آمدورفت کا سلسلہ جاری رہا جن میں ایک مرتبہ عُروہ بن مَسعود ثَقفی

کُفّار کی جانب سے آئے کہ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، بعد میں مسلمان ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بھی وہی گفتگو فرمائی جو بدیل سے کی تھی۔ عروہ نے عرض کیا: اے محمد! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ عرب کا بالکل خاتمہ کر دو تو یہ ممکن نہیں، تم نے کبھی نہ سنا ہوگا کہ تم سے پہلے کوئی شخص ایسا گذرا ہو جس نے عرب کو بالکل فنا کر دیا ہو اور اگر دوسری صورت ہوئی کہ وہ تم پر غالب ہو گئے تو یاد رکھو کہ میں تمہارے ساتھ اشراف کی جماعت نہیں دیکھتا۔ یہ اطراف کے کم ظرف لوگ تمہارے ساتھ ہیں، مصیبت پڑنے پر سب بھاگ جائیں گے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پاس کھڑے ہوئے تھے، یہ جملہ سن کر غصہ میں بھر گئے اور ارشاد فرمایا کہ تو اپنے معبود ''لات'' کی پیشاب گاہ کو چاٹ۔ کیا ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھاگ جائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اکیلا چھوڑ دیں گے؟ عروہ نے پوچھا یہ کون ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمہارا ایک قدیمی احسان مجھ پر ہے جس کا میں بدلہ نہیں دے سکا، اگر یہ نہ ہوتا تو اس گالی کا جواب دیتا۔ یہ کہہ کر عروہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بات میں مشغول ہو گئے اور عرب کے عام دستور کے موافق بات کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک کی طرف ہاتھ لے جاتے کہ خوشامد کے موقع پر داڑھی میں ہاتھ لگا کر بات کی جاتی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات کب گوارا ہو سکتی تھی۔ عروہ کے بھتیجے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سر پر خود (لوہے کی ٹوپی) اوڑھے ہوئے اور ہتھیار لگائے ہوئے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے تلوار کا قبضہ عُروہ کے ہاتھ پر مارا کہ ہاتھ پرے کو رکھو۔ عُروہ نے پوچھا: کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مغیرہ۔ عُروہ نے کہا: او غدار! تیری غداری کو میں اب تک بھگت رہا ہوں اور تیرا یہ برتاؤ؟ (حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اسلام سے قبل چند کافروں کو قتل کر دیا تھا جن کی دیت عروہ نے ادا کی تھی اس کی طرف یہ اشارہ تھا) غرض وہ طویل گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہے اور نظریں بچا بچا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات کا اندازہ بھی کرتے جاتے تھے، چنانچہ واپس جا کر کُفّار سے کہا: اے قریش! میں بڑے بڑے بادشاہوں کے یہاں گیا ہوں۔ قیصر و کِسریٰ اور نجاشی کے درباروں کو بھی دیکھا ہے اور ان کے آداب بھی دیکھے ہیں۔ خدا کی قسم! میں نے کسی

بادشاہ کو نہیں دیکھا کہ اس کی جماعت اس کی ایسی تعظیم کرتی ہو جیسی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت ان کی تعظیم کرتی ہے، اگر وہ تھوکتے ہیں تو جس کے ہاتھ پر پڑ جائے وہ اس کو بدن اور منہ پر مل لیتا ہے، جو بات محمد کے منہ سے نکلتی ہے اس کے پورا کرنے کو سب کے سب ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ان کے وضو کا پانی آپس میں لڑ لڑ کر تقسیم کرتے ہیں، زمین پر نہیں گرنے دیتے۔ اگر کسی کو قطرہ نہ ملے تو وہ دوسرے کے تر ہاتھ سے مل کر اپنے منہ پر مل لیتا ہے۔ ان کے سامنے بولتے ہیں تو بہت نیچی آواز سے، ان کے سامنے زور سے نہیں بولتے، ان کی طرف نگاہ اٹھا کر ادب کی وجہ سے نہیں دیکھتے۔ اگر ان کے سر یا داڑھی کا کوئی بال گرتا ہے تو اس کو تبرّک کا اٹھا لیتے ہیں اور اس کی تعظیم اور احترام کرتے ہیں۔ غرض میں نے کسی جماعت کو اپنے آقا کے ساتھ اتنی محبّت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جماعت ان کے ساتھ کرتی ہے۔

اسی دوران میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف سے قاصد بنا کر سردارانِ مکّہ کے پاس بھیجا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی باوجود مسلمان ہو جانے کے مکّہ میں بہت عزت تھی اور ان کے متعلق زیادہ اندیشہ نہ تھا، اس لئے ان کو تجویز فرمایا تھا۔ وہ تشریف لے گئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو رشک ہوا کہ عثمان تو مزے سے کعبہ کا طواف کر رہے ہوں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے امید نہیں کہ وہ میرے بغیر طواف کریں، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکّہ میں داخل ہوئے تو ابان بن سعید نے ان کو اپنی پناہ میں لے لیا اور ان سے کہا: جہاں دل چاہے چلو پھرو، تم کو کوئی روک نہیں سکتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، ابوسفیان وغیرہ مکّہ کے سرداروں سے ملتے رہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام پہنچاتے رہے۔ جب واپس ہونے لگے تو کُفّار نے خود درخواست کی کہ تم مکّہ میں آئے ہو، تم طواف کرتے جاؤ۔ انہوں نے جواب دے دیا کہ یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو روکے گئے ہوں اور میں طواف کر لوں۔ قریش کو اس جواب پر غصّہ آیا جس کی وجہ سے انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو روک لیا۔ مسلمانوں کو یہ خبر پہنچی کہ ان کو شہید کر دیا۔ اس پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اخیر دم تک لڑنے پر بیعت لی۔ جب کفّار کو اس کی خبر پہنچی تو گھبرا گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو فوراً چھوڑ دیا۔[1]

---

[1] خمیس

ف: اس قصہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ارشاد، حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کا مارنا، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عام برتاؤ جس کو عروہ نے بہت غور سے دیکھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا طواف سے انکار، ہر واقعہ ایسا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے انتہا عشق و محبّت کی خبر دیتا ہے۔ یہ بیعت جس کا اس قصّہ میں ذکر ہے ''بَیعَۃُ الشَّجرۃ'' کہلاتی ہے۔ قرآن پاک میں بھی اس کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح کی آیت ''لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ'' الآیۃ (الفتح:۱۸) میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ پوری آیت مع ترجمہ کے عنقریب خاتمہ میں آرہی ہے۔

(۵) حضرت ابنِ زُبیر رضی اللہ عنہما کا خون پینا

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ سینگیاں لگوائیں اور جو خون نکلا وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو دیا کہ اس کو کہیں دبا دیں، وہ گئے اور آکر عرض کیا کہ دبا دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کہاں؟ عرض کیا: میں نے پی لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس کے بدن میں میرا خون جائے گا اس کو جہنّم کی آگ نہیں چھو سکتی، مگر تیرے لئے بھی لوگوں سے ہلاکت ہے اور لوگوں کو تجھ سے۔

ف: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فُضلات پاخانہ، پیشاب وغیرہ سب پاک ہیں، اس لئے اس میں کوئی اشکال نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب کہ ''ہلاکت ہے''۔ علماء نے لکھا ہے کہ سلطنت اور امارت کی طرف اشارہ ہے کہ امارت ہوگی اور لوگ اس میں مُزاحم ہوں گے، چنانچہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جب پیدا ہوئے تھے اس وقت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرف اشارہ فرمایا تھا کہا ایک مینڈھا ہے بھیڑیوں کے درمیان، ایسے بھیڑیئے جو کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے، چنانچہ یزید اور عبدالملک دونوں کے ساتھ حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ کی مشہور لڑائی ہوئی اور آخر شہید ہوئے۔

(۶) حضرت مالک بن سنان رضی اللہ عنہ کا خون پینا

اُحد کی لڑائی میں جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور یا سر مبارک میں خَود[1] کے دو حلقے

---

[1] خمیس

گھس گئے تھے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ دوڑے ہوئے آگے بڑھے اور دوسری جانب سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دوڑے اور آگے بڑھ کر خَود کے حلقے دانت سے کھینچنے شروع کئے۔ ایک حلقہ نکالا جس سے ایک دانت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا ٹوٹ گیا، اس کی پرواہ نہ کی۔ دوسرا حلقہ کھینچا جس سے دوسرا دانت بھی ٹوٹا لیکن حلقہ وہ بھی کھینچ ہی لیا۔ ان حلقوں کے نکلنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک جسم سے خون نکلنے لگا تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے والد ماجد مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے اپنے لبوں سے اس خون کو چوس لیا اور نگل لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے خون میں میرا خون ملا ہے اس کو جہنّم کی آگ نہیں چھو سکتی۔[1]

(۷) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا اپنے باپ کو انکار

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ زمانۂ جاہلیت میں اپنی والدہ کے ساتھ ننھیال جا رہے تھے، بنوقیس نے قافلہ کو لوٹا جس میں زید رضی اللہ عنہ بھی تھے ان کو مکّہ کے بازار میں لا کر بیچا۔ حکیم بن حزام نے اپنی پھوپھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے لئے ان کو خرید لیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نکاح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہوا تو انہوں نے زید رضی اللہ عنہ کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کر دیا۔ زید رضی اللہ عنہ کے والد کو ان کے فِراق کا بہت صدمہ تھا اور ہونا ہی چاہئے تھا کہ اولاد کی محبت فطری چیز ہے۔ وہ زید رضی اللہ عنہ کے فراق میں روتے اور اشعار پڑھتے پھرا کرتے تھے۔ اکثر جو اشعار پڑھتے تھے ان کا مختصر ترجمہ یہ ہے کہ میں زید کی یاد میں روتا ہوں اور یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہے تاکہ اس کی امید کی جائے یا موت نے اس کو نمٹا دیا۔ خدا کی قسم! مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تجھے اے زید! نرم زمین نے ہلاک کیا یا کسی پہاڑ نے ہلاک کیا۔ کاش! مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ تو عمر بھر میں کبھی بھی واپس آئے گا یا نہیں۔ ساری دنیا میں میری انتہائی غرض تیری واپسی ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے جب بھی مجھے زید ہی یاد آتا ہے اور جب بارش ہونے کو ہوتی ہے جب بھی اس کی یاد مجھے ستاتی ہے اور جب ہوائیں چلتی ہیں تو وہ بھی اس کی یاد کو بھڑکاتی ہیں۔ ہائے! میرا غم اور میرا فکر کس قدر طویل ہو گیا۔ میں اس کی تلاش اور کوشش میں ساری دنیا میں اونٹ کی تیز رفتاری کو کام

[1] قرۃ العیون

میں لاؤں گا اور دنیا کا چکر لگانے سے نہیں اکتاؤں گا۔ اونٹ چلنے سے اکتا جائیں تو اکتا جائیں لیکن میں کبھی بھی نہیں اکتاؤں گا، اپنی ساری زندگی اسی میں گذار دوں گا۔ ہاں! میری موت ہی آ گئی تو خیر کہ موت ہر چیز کو فنا کر دینے والی ہے۔ آدمی خواہ کتنی ہی امیدیں لگاویں، مگر میں اپنے بعد فلاں فلاں رشتہ داروں اور آل اولاد کو وصیّت کر جاؤں گا کہ وہ بھی اسی طرح زید کو ڈھونڈتے رہیں۔

غرض یہ اشعار وہ پڑھتے تھے اور روتے ہوئے ڈھونڈتے پھرا کرتے تھے۔ اتفاق سے ان کی قوم کے چند لوگوں کا حج کو جانا ہوا اور انہوں نے زید رضی اللہ عنہ کو پہچانا، باپ کا حال سنایا، شعر سنائے، ان کی یاد و فراق کی داستان سنائی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان کے ہاتھ تین شعر کہہ کر بھیجے جن کا مطلب یہ تھا کہ میں یہاں مکّہ میں ہوں، خیریت سے ہوں، تم غم اور صدمہ نہ کرو۔ میں بڑے کریم لوگوں کی غلامی میں ہوں۔ ان لوگوں نے جا کر زید رضی اللہ عنہ کی خیر و خبر ان کے باپ کو سنائی اور وہ اشعار سنائے جو زید رضی اللہ عنہ نے کہہ کر بھیجے تھے اور پتہ بتایا۔ زید رضی اللہ عنہ کے باپ اور چچا فدیہ کی رقم لے کر ان کو غلامی سے چھڑانے کی نیت سے مکّہ مکرّمہ پہنچے، تحقیق کی، پتہ چلایا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، عرض کیا: اے ہاشم کی اولاد اور اپنی قوم کے سردار! تم لوگ حرم کے رہنے والے ہو اور اللہ کے گھر کے پڑوسی۔ تم خود قیدیوں کو رہا کراتے ہو، بھوکوں کو کھانا دیتے ہو۔ ہم اپنے بیٹے کی طلب میں تمہارے پاس پہنچے ہیں، ہم پر احسان کرو اور کرم فرماؤ اور فدیہ قبول کر لو اور اس کو رہا کر دو، بلکہ جو فدیہ ہو اس سے زیادہ لے لو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: زید کی طلب میں ہم لوگ آئے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بس اتنی سی بات ہے۔ عرض کیا کہ حضور! بس یہی غرض ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کو بلا لو اور اس سے پوچھ لو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جانا چاہے تو بغیر فدیہ ہی کے وہ تمہاری نذر ہے اور اگر نہ جانا چاہے تو میں ایسے شخص پر جَبَر نہیں کر سکتا جو خود نہ جانا چاہے۔ انہوں نے عرض کیا: آپ نے اِستحقاق سے بھی زیادہ احسان فرمایا۔ یہ بات خوشی سے منظور ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ بلائے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم ان کو پہچانتے ہو؟ عرض کیا: جی ہاں! پہچانتا ہوں، یہ میرے باپ ہیں اور یہ میرے چچا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرا حال بھی تمہیں معلوم ہے، اب تمہیں اختیار ہے کہ میرے پاس رہنا چاہو تو میرے پاس رہو، ان کے ساتھ جانا چاہو تو اجازت ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ حضور! میں آپ کے مقابلہ میں بھلا کس کو پسند کر سکتا ہوں۔ آپ میرے لئے باپ کی جگہ بھی ہیں اور چچا کی جگہ بھی۔ ان دونوں باپ چچا نے کہا کہ زید! غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے ہو اور باپ چچا اور سب گھر والوں کے مقابلہ میں غلام رہنے کو پسند کرتے ہو؟ زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! میں نے ان میں (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ کر کے) ایسی بات دیکھی ہے جس کے مقابلہ میں میں کسی چیز کو بھی پسند نہیں کر سکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ جواب سنا تو ان کو گود میں لے لیا اور فرمایا کہ میں نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا۔ زید رضی اللہ عنہ کے باپ اور چچا بھی یہ منظر دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور خوشی سے ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔[1] حضرت زید رضی اللہ عنہ اس وقت بچے تھے، بچپن کی حالت میں سارے گھر کو، عزیز و اقارب کو غلامی پر قربان کر دینا جس محبت کا پتہ دیتا ہے وہ ظاہر ہے۔

(۸) حضرت اَنَس بن نَضر رضی اللہ عنہ کا عمل اُحد کی لڑائی میں

اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو جب شکست ہو رہی تھی تو کسی نے یہ خبر اڑا دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید ہو گئے، اس وحشت ناک خبر سے جو اثر صحابہ پر ہونا چاہئے تھا وہ ظاہر ہے، اسی وجہ سے اور بھی زیادہ گھٹنے ٹوٹ گئے۔ حضرت اَنَس بن نَضر رضی اللہ عنہ چلے جا رہے تھے کہ مہاجرین اور انصار رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نظر پڑے کہ سب حضرات پریشان حال تھے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یہ کیا ہو رہا ہے کہ مسلمان پریشان سے نظر آ رہے ہیں؟ ان حضرات نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم ہی زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ تلوار ہاتھ میں لو اور چل کر مر جاؤ، چنانچہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے خود تلوار ہاتھ میں لی اور کُفّار کے جمگھٹے میں گھس گئے اور اس وقت تک لڑتے رہے کہ شہید ہوئے۔[1]

ف: ان کا مطلب یہ تھا کہ جس ذات کے دیدار کے لئے جینا تھا جب وہ ہی نہیں

[1] خمیس

رہی تو پھر گویا جی کر ہی کیا کرنا ہے، چنانچہ اسی میں اپنی جان نثار کردی۔

(۹) سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کا پیام اُحد میں

اسی اُحد کی لڑائی میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ سعد بن ربیع کا حال معلوم نہیں ہوا کہ کیا گذری۔ ایک صحابی کو تلاش کے لئے بھیجا۔ وہ شہداء کی جماعت میں تلاش کر رہے تھے، آوازیں بھی دے رہے تھے کہ شاید زندہ ہوں۔ پھر پکار کر کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا ہے کہ سعد بن ربیع کی خبر لاؤں تو ایک جگہ سے بہت ضعیف سی آواز آئی۔ یہ اس طرف بڑھے، جا کر دیکھا کہ سات مقتولین کے درمیان پڑے ہیں اور ایک آدھ سانس باقی ہے۔ جب یہ قریب پہنچے تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو میرا سلام عرض کر دینا اور کہہ دینا کہ اللہ تعالیٰ میری جانب سے آپ کو اس سے افضل اور بہتر بدلہ عطا فرمائیں جو کسی نبی کو اس کے امتی کی طرف سے بہتر سے بہتر عطا کیا ہو اور مسلمانوں کو میرا یہ پیام پہنچا دینا کہ اگر کافر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے اور تم میں سے کوئی ایک آنکھ بھی چمکتی ہوئی رہے یعنی وہ زندہ رہا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی عذر بھی تمہارا نہ چلے گا اور یہ کہہ کر جان بحق ہو گئے۔[1]

ف: ''فَجَزَاهُ اللّٰهُ عَنَّا اَفْضَلَ مَاجَزٰى صَحَابِيًا عَنْ اُمَّةِ نَبِيِّهٖ'' درحقیقت ان جان نثاروں نے (اللہ تعالیٰ اپنے لطف سے ان کی قبروں کو نور سے بھر دے) اپنی جانثاری کا پورا ثبوت دے دیا کہ زخموں پر زخم لگے ہوئے ہیں، دم توڑ رہے ہیں مگر کیا مجال ہے کہ کوئی شکوہ، کوئی گھبراہٹ، کوئی پریشانی لاحق ہو جائے۔ ولولہ ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جاں نثاری کا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قربانی کا۔ کاش! مجھ سے نااہل کو بھی کوئی حصّہ اس محبّت کا نصیب ہو جاتا۔

(۱۰) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر دیکھ کر ایک عورت کی موت

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ایک عورت حاضر ہوئیں اور آکر عرض کیا کہ مجھے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کی زیارت کرا دو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حجرہ

[1] خمیس

شریفہ کھولا۔ انہوں نے زیارت کی اور زیارت کر کے روتی رہیں اور روتے روتے انتقال فرما گئیں رضی اللہ عنہا وارضاہا۔[1]

ف: کیا اس عشق کی نظیر بھی کہیں ملے گی کہ قبر کی زیارت کی تاب نہ لاسکیں اور وہیں جان دے دی۔

(۱۱) صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبّت کے مُتفرّق قصّے

حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبّت تھی؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ خدائے پاک کی قسم! حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم لوگوں کے نزدیک اپنے مالوں سے اور اپنی اولادوں سے اور اپنی ماؤں سے اور سخت پیاس کی حالت میں ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب تھے۔[2]

ف: سچ فرمایا درحقیقت صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی حالت تھی اور کیوں نہ ہوتی جب کہ وہ حضرات کاملُ الایمان تھے اور اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

"قُلْ اِنْ كَانَ آبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝" (التوبہ:۲۴)

ترجمہ: آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو اگر یہ سب چیزیں تم کو اللہ سے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں[3] پہنچاتا۔

---

[1]، [2] شفا [3] بیان القرآن

اس آیتِ شریفہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے ان سب چیزوں سے کم ہونے پر وعید ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میری محبت اپنے باپ اور اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی مضمون نقل کیا گیا ہے۔ علماء کا ارشاد ہے کہ ان احادیث میں محبت سے محبتِ اختیاری مراد ہے، غیر اختیاری یعنی طبعی اضطراری مراد نہیں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر محبت طبعی مراد ہو تو پھر ایمان سے مراد کمال درجہ کا ایمان ہو جیسا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں وہ پائی جائیں ایمان کی حلاوت اور ایمان کا مزہ نصیب ہو جائے: ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت ان کے ماسوا سب سے زیادہ ہو۔ دوسرے یہ کہ جس کسی سے محبت کرے اللہ ہی کے واسطے کرے۔ تیسرے یہ کہ کفر کی طرف لوٹنا اس کو ایسا ہی گراں اور مشکل ہو جیسا کہ آگ میں گرنا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ یا رسولَ اللہ مجھے اپنی جان کے علاوہ اور سب چیزوں سے آپ زیادہ محبوب ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص مؤمن اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک اس کو میری محبت اپنی جان سے بھی زیادہ نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلْاٰنَ یَا عُمَرُ (اس وقت اے عمر!) علماء نے اس ارشاد کے دو مطلب بتائے ہیں: ایک یہ کہ اس وقت تمہارا ایمان کامل ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ تنبیہ ہے کہ اس وقت یہ بات پیدا ہوئی کہ میں تمہیں اپنے نفس سے زیادہ محبوب ہوں، حالانکہ یہ بات اول ہی سے ہونا چاہئے تھی۔ سُہیل تُستَری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جو شخص ہر حال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا والی نہ جانے اور اپنے نفس کو اپنی مِلک میں سمجھے وہ سنت کا مزہ نہیں چکھ سکتا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے لئے کیا تیار کر رکھا ہے جس کی وجہ سے انتظار ہے؟ انہوں نے عرض

کیا: یارسول اللہ! میں نے بہت سی نمازیں اور روزے اور صدقے تو تیار کر نہیں رکھے ہیں، البتہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میرے دل میں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت میں تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت رکھتے ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہے کئی صحابہ نے نقل کیا ہے جن میں عبداللہ بن مسعود، ابوموسیٰ اشعری، صفوان، ابوذر رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ حضرات ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جس قدر خوشی اس ارشادِ مبارک سے ہوئی ہے کسی چیز سے بھی اتنی خوشی نہیں ہوئی اور ظاہر بات ہے ہونا بھی چاہئے تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت تو ان کے رگ و پے میں تھی، پھر ان کو کیوں نہ خوشی ہوتی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مکان شروع میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا دور تھا۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرا دل چاہتا تھا، تمہارا مکان تو قریب ہی ہو جاتا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ حارثہ رضی اللہ عنہ کا مکان آپ کے قریب ہے، ان سے فرماویں کہ میرے مکان سے بدل لیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان سے پہلے بھی تبادلہ ہو چکا ہے، اب تو شرم آتی ہے۔ حارثہ رضی اللہ عنہ کو اس کی اطلاع ہوئی، فوراً حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ فاطمہ کا مکان اپنے قریب چاہتے ہیں۔ یہ میرے مکانات موجود ہیں، ان سے زیادہ قریب کوئی مکان بھی نہیں، جونسا پسند ہو بدل لیں۔ یارسول اللہ! میں اور میرا مال تو اللہ اور اس کے رسول ہی کا ہے۔ یارسول اللہ! خدا کی قسم! جو مال آپ لے لیں وہ مجھے زیادہ پسند ہے اس مال سے جو میرے پاس رہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سچ کہتے ہو اور برکت کی دعا دی اور مکان بدل لیا[1]۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ کی محبت مجھے میری جان و مال اور اہل و عیال سے زیادہ ہے، میں اپنے گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کا خیال آجاتا ہے تو صبر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ حاضر ہوں اور آکر زیارت نہ کرلوں۔ مجھے یہ فکر ہے کہ موت تو آپ کو بھی اور مجھے بھی ضرور آنی ہی ہے، اس کے بعد آپ تو انبیاء علیہم السلام کے درجہ پر چلے جائیں گے تو مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ پھر میں آپ کو نہیں دیکھ

---

[1] طبقات

سکوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سکوت فرمایا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور یہ آیت سنائی:

''وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝'' (النساء:۶۹)

ترجمہ: ''جو شخص اللہ اور رسول کا کہنا مان لے گا تو ایسے اشخاص بھی جنّت میں ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء اور صدّیقین اور شہداء اور صلحاء اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں اور ان کے ساتھ رفاقت محض اللہ کا فضل ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں ہر ایک کے عمل کو''۔

اس قسم کے واقعات بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کو پیش آئے اور آنا ضروری تھے۔ عشق است و ہزار بدگمانی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہی آیت سنائی، چنانچہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے آپ سے ایسی محبّت ہے کہ جب خیال آجاتا ہے اگر اس وقت میں آکر زیارت نہ کرلوں تو مجھے غالب گمان ہے کہ میری جان نکل جائے، مگر مجھے یہ خیال ہے کہ اگر میں جنّت میں داخل بھی ہوگیا تب بھی آپ سے تو نیچے درجہ میں ہوں گا، مجھے تو جنّت میں بھی آپ کی زیارت کے بغیر بڑی مشقت ہوگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی آیت سنائی۔ ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ ایک انصاری رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے اور نہایت غمگین تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: غمگین کیوں ہو؟ عرض کیا: یارسول اللہ! ایک سوچ میں ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: کیا سوچ ہے؟ عرض کیا: یارسول اللہ! ہم صبح وشام حاضرِ خدمت ہوتے ہیں۔ آپ کی زیارت سے محظوظ ہوتے ہیں آپ کی خدمت میں بیٹھتے ہیں۔ کل کو آپ تو انبیاء علیہم السلام کے درجے پر پہنچ جائیں گے۔ ہماری وہاں تک رسائی نہیں ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انصاری کو بھی بلایا اور ان کو اس کی بشارت دی۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ بہت سے صحابہ نے یہ اشکال

کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت ان کو سنائی۔ ایک حدیث میں ہے صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو ظاہر ہے کہ نبی کو امتی پر فضیلت ہے اور جنّت میں اس کے درجہ اونچے ہوں گے تو پھر اکٹھا ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اوپر کے درجہ والے نیچے کے درجہ والوں کے پاس آئیں گے، ان کے پاس بیٹھیں گے بات چیت کریں گے۔[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھ سے بہت محبّت کرنے والے بعض ایسے لوگ ہوں گے جو میرے بعد پیدا ہوں گے اور ان کی یہ تمنّا ہوگی کہ کاش! اپنے اہل وعیال اور مال کے بدلے میں وہ مجھے دیکھ لیتے۔ خالد رضی اللہ عنہ کی بیٹی عبدہ کہتی ہیں کہ میرے والد جب بھی سونے لیٹتے تو اتنے آنکھ نہ لگتی اور جاگتے رہتے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد اور شوق واشتیاق میں لگے رہتے اور مہاجرین وانصار صحابہ رضی اللہ عنہم کا نام لے کر یاد کرتے رہتے اور یہ کہتے کہ یہی میرے اصول وفروع ہیں (یعنی بڑے اور چھوٹے) اور ان کی طرف میرا دل کھنچا جا رہا ہے، یا اللہ! مجھے جلد ہی موت دیدے کہ ان لوگوں سے جا کر ملوں اور یہی کہتے کہتے سو جاتے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے اپنے باپ کے مسلمان ہونے کی بہ نسبت آپ کے چچا ابوطالب کے مسلمان ہو جانے کی زیادہ تمنّا ہے، اس لئے کہ اس سے آپ کو زیادہ خوشی ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ آپ کے اسلام لانے کی مجھے زیادہ خوشی ہے اپنے باپ کے مسلمان ہونے سے، اس لئے کہ آپ کا اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ محبوب ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رات کو حفاظتی گشت فرما رہے تھے کہ ایک گھر میں سے چراغ کی روشنی محسوس ہوئی اور ایک بڑھیا کی آواز کان میں پڑی جو اُون کو دھنتی ہوئی اشعار پڑھ رہی تھی جن کا ترجمہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نیکوں کا درود پہنچے اور پاک صاف لوگوں کی طرف سے جو برگزیدہ ہوں ان کا درود پہنچے۔ بیشک یارسول اللہ! آپ راتوں کو عبادت کرنے والے تھے اور اخیر راتوں کو رونے والے تھے۔ کاش! مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ میں اور میرا محبوب کبھی اکٹھے ہو سکتے ہیں یا نہیں، اس لئے کہ موت مختلف حالتوں میں آتی ہے، نہ معلوم

[1] درمنثور

میری موت کس حالت میں آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مرنے کے بعد ملنا ہو سکے یا نہ ہو سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان اشعار کو سن کر رونے بیٹھ گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا قصّہ مشہور ہے ہی کہ جب ان کے انتقال کا وقت ہوا تو ان کی بیوی جدائی پر رنجیدہ ہو کر کہنے لگی کہ ہائے افسوس! وہ کہنے لگے: سبحان اللہ! کیا مزے کی بات ہے کہ کل کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کریں گے اور ان کے صحابہ سے ملیں گے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قصّہ باب ۵ کے قصّہ نمبر ۹ میں گذر چکا ہے کہ جب ان کو سولی دی جانے لگی تو ابوسفیان نے پوچھا کہ کیا تجھے یہ گوارا ہے کہ ہم تجھے چھوڑ دیں اور تیرے بجائے خدانخواستہ حضور کے ساتھ یہ معاملہ کریں تو زید رضی اللہ عنہ نے کہا: خدا کی قسم! مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دولت کدہ پر تشریف فرما ہوں اور وہاں ان کے کانٹا چبھ جائے اور میں اپنے گھر آرام سے رہ سکوں۔ ابوسفیان کہنے لگا کہ میں نے کبھی کسی کو کسی کے ساتھ اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی محمد کی جماعت کو ان سے ہے۔

تنبیہ: علماء نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبّت کی مختلف علامات لکھی ہیں۔ قاضی عِیاض فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اس کو ماسویٰ پر ترجیح دیتا ہے، یہی معنیٰ محبّت کے ہیں، ورنہ محبّت نہیں محض دعویٰ محبّت ہے۔ پس حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبّت کی علامات میں سب سے مہتم بالشان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدا کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو اختیار کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کرے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی بجا آوری کرے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے روک دیا ہے ان سے پرہیز کرے۔ خوشی میں، رنج میں، تنگی میں، وسعت میں؛ ہر حال میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر چلے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے: "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ط" (آلِ عمران: ۳۱) ترجمہ: آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبّت رکھتے ہو تو تم میرا اتباع کرو، خدا تعالیٰ تم سے محبّت کرنے لگیں گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے ہیں بڑے رحم فرمانے والے ہیں۔

خاتمہ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ برتاؤ اور ان کے اجمالی فضائل

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ چند قصّے نمونہ کے طور پر لکھے گئے ہیں، ورنہ ان کے حالات بڑی ضخیم کتابوں میں بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ اردو میں بھی مُتعدِّد کتابیں اور رسالے اس مضمون کے ملتے ہیں، کئی مہینے ہوئے یہ رسالہ شروع کیا تھا، پھر مدرسہ کے مشاغل اور وقتی عوارض کی وجہ سے تعویق میں پڑ گیا۔ اس وقت ان اوراق پر خاتمہ کرتا ہوں کہ جتنے لکھے جا چکے ہیں وہ قابلِ انتفاع ہو جائیں۔ اخیر میں ایک ضروری امر پر تنبیہ بھی اشد ضروری ہے وہ یہ کہ اس آزادی کے زمانہ میں جہاں ہم مسلمانوں میں دین کے اور بہت سے امور میں کوتاہی اور آزادی کا رنگ ہے وہاں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حق شناسی اور ان کے ادب و احترام میں بھی حد سے زیادہ کوتاہی ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر بعض دین سے بے پرواہ لوگ تو ان کی شان میں گستاخی تک کرنے لگتے ہیں، حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دین کی بنیاد ہیں۔ دین کے اول پھیلانے والے ہیں۔ ان کے حقوق سے ہم لوگ مرتے دم تک بھی عہدہ برآء نہیں ہو سکتے۔ حق تعالیٰ شانہٗ اپنے فضل سے ان پاک نفوس پر لاکھوں رحمتیں نازل فرمائیں کہ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دین حاصل کیا اور ہم لوگوں تک پہنچایا، اس لئے اس خاتمہ میں قاضی عِیاض رحمۃ اللہ علیہ کی ''شفا'' کی ایک فصل کا مختصر ترجمہ جو اس کے مناسب ہے درج کرتا ہوں اور اسی پر اس رسالہ کو ختم کرتا ہوں۔

وہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اعزاز و اکرام میں داخل ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کا اعزاز و اکرام کرنا اور ان کے حق کو پہچاننا اور ان کا اتباع کرنا اور ان کی تعریف کرنا اور ان کے لئے استغفار اور دعائے مغفرت کرنا اور ان کے آپس کے اختلاف میں لب کُشائی نہ کرنا اور مؤرخین اور شیعہ اور بدعتی اور جاہل راویوں کی ان خبروں سے اِعراض کرنا جو ان حضرات کی شان میں نقص پیدا کرنے والی ہوں اور اس نوع کی کوئی روایت اگر سننے میں آئے تو اس کی کوئی اچھی تاویل کرے اور کوئی اچھا مَحمل تجویز کرے کہ وہ

اس کے مستحق ہیں اور ان حضرات کو برائی سے یاد نہ کرے، بلکہ ان کی خوبیاں اور ان کے فضائل بیان کیا کرے اور عیب کی باتوں سے سکوت کرے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب میرے صحابہ کا ذکر (یعنی برا ذکر) ہو تو سکوت کیا کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے فضائل قرآن شریف اور احادیث میں بکثرت وارد ہیں۔ حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے:

"مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝" (الفتح:۲۹)

ترجمہ: "محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں کے مقابلہ میں سخت ہیں اور آپس میں مہربان اور اے مخاطب! تو ان کو دیکھے گا کہ کبھی رکوع کرنے والے ہیں، کبھی سجدہ کرنے والے ہیں، اور اللہ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی عبدیت کے آثار بوجہِ تاثیر ان کے سجدہ کے ان کے چہروں پر نمایاں ہیں، یہ ان کے اوصاف توریت میں ہیں۔ اور انجیل میں ان کی یہ مثال ذکر کی ہے کہ جیسے کھیتی کہ اس نے اوّل اپنی سوئی نکالی، پھر اس نے اپنی سوئی کو قوی کیا (یعنی وہ کھیتی موٹی ہوئی)، پھر وہ کھیتی اور موٹی ہوئی، پھر اپنے تنہ پر سیدھی کھڑی ہوئی کہ کسانوں کو بھلی معلوم ہونے لگی (اسی طرح صحابہ رضی اللہ عنہم میں اول ضعف تھا، پھر روزانہ قوت بڑھتی گئی اور اللہ تعالیٰ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس لئے یہ نشو ونما دیا) تاکہ ان سے کافروں کو حسد میں جلاوے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ نے ان صاحبوں سے جو کہ ایمان لائے اور نیک کام کررہے ہیں مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کررکھا ہے۔"

یہ ترجمہ اس صورت میں ہے کہ توراۃ پر آیت ہو اور آیت کے فرق سے ترجمہ میں بھی

فرق ہو جائے گا جو تفاسیر سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اسی سورۃ میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

"لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ○ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○" (الفتح: ۱۸، ۱۹)

ترجمہ: "تحقیق اللہ تعالیٰ ان مسلمانوں سے (جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم سفر ہیں) خوش ہوا جب کہ یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے اور ان کے دلوں میں جو کچھ (اخلاص اور عزم) تھا اللہ تعالیٰ کو وہ بھی معلوم تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں اطمینان پیدا کر دیا تھا اور ان کو ایک لگتے ہاتھ فتح بھی دے دی (مراد اس سے فتحِ خیبر ہے جو اس کے قریب ہی ہوئی) اور بہت سی غنیمتیں بھی دیں اور اللہ تعالیٰ بڑا زبردست حکمت والا ہے۔"

یہ ہی وہ بیعت ہے جس کو بَیْعَتُ الشجرۃ کہا جاتا ہے۔ اخیر باب کے قصہ نمبر ۴ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ○ (الاحزاب: ۲۳)

ترجمہ: "ان مومنین میں ایسے لوگ ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے، پھر ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے (یعنی شہید ہو چکے) اور بعض ان میں اس کے مشتاق و منتظر ہیں (ابھی شہید نہیں ہوئے) اور اپنے ارادہ میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں کیا۔"

ایک جگہ ارشادِ خداوندی ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○ (التوبہ: ۱۰۰)

ترجمہ: ''اور جو مہاجرین وانصار (ایمان لانے میں سب امت سے) مقدم ہیں اور جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہوا اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے''۔

ان آیات میں اللہ جَلَّ شَانُہٗ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف اور ان سے خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے، اسی طرح احادیث میں بھی بہت کثرت سے فضائل وارد ہوئے ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے بعد ابوبکر وعمر کا اقتدا کیا کرو۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ میرے صحابہ ستاروں کی طرح ہیں، جس کا اتباع کرو گے ہدایت پاؤ گے۔ محدثین کو اس حدیث میں کلام ہے اور اسی وجہ سے قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ پر اس کے ذکر کرنے میں اعتراض ہے، مگر ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ تعدُّدِ طرق کی وجہ سے ان کے نزدیک قابل اعتبار ہو یا فضائل میں ہونے کی وجہ سے ذکر کیا ہو۔ (کیونکہ فضائل میں معمولی ضعف کی روایتیں ذکر کر دی جاتی ہیں)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مثال کھانے میں نمک کی سی ہے کہ کھانا بغیر نمک کے اچھا نہیں ہوسکتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ اللہ سے میرے صحابہ کے بارے میں ڈرو، ان کو ملامت کا نشانہ نہ بناؤ۔ جو شخص ان سے محبّت رکھتا ہے میری محبّت کی وجہ سے ان سے محبّت رکھتا ہے اور جو ان سے بغض رکھتا ہے وہ میرے بغض کی وجہ سے بغض رکھتا ہے، جو شخص ان کو اذیّت دے اس نے مجھ کو اذیّت دی اور جس نے مجھ کو اذیّت دی اس نے اللہ کو اذیّت دی اور جو شخص اللہ کو اذیّت دیتا ہے قریب ہے کہ پکڑ میں آجائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ میرے صحابہ کو گالیاں نہ دیا کرو، اگر تم میں سے کوئی شخص احد کے پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے تو وہ ثواب کے اعتبار سے صحابہ کے ایک مُد یا آدھے مُد کے برابر بھی نہیں ہوسکتا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص صحابہ کو گالیاں دے اس پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں کی لعنت اور تمام آدمیوں کی لعنت، نہ

اس کا فرض قبول ہے نہ نفل۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ تمام مخلوق میں سے میرے صحابہ کو چھانٹا ہے اور ان میں سے چار کو ممتاز کیا ہے: ابوبکر، عمر، عثمان، علی؛ ان کو میرے سب صحابہ سے افضل قرار دیا۔

ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جس شخص نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے محبّت کی اس نے دین کو سیدھا کیا اور جس نے عمر رضی اللہ عنہ سے محبّت کی اس نے دین کے واضح راستے کو پالیا اور جس نے عثمان رضی اللہ عنہ سے محبّت کی وہ اللہ کے نور کے ساتھ منور ہوا اور جس نے علی رضی اللہ عنہ سے محبّت کی اس نے دین کی مضبوط رسی کو پکڑ لیا۔ جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی تعریف کرتا ہے وہ نفاق سے بری ہے اور جو صحابہ رضی اللہ عنہم کی بے ادبی کرتا ہے وہ بدعتی، منافق، سنت کا مخالف ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اس کا کوئی عمل قبول نہ ہو۔ یہاں تک کہ اُن سب کو محبوب رکھے اور ان کی طرف سے دل صاف ہو۔

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اے لوگو! میں ابوبکر سے خوش ہوں، تم لوگ ان کا مرتبہ پہچانو۔ میں عمر سے، عثمان سے، علی سے، طلحہ سے، زبیر سے، سعد سے، سعید سے، عبدالرحمٰن بن عوف سے، ابوعبیدہ سے، خوش ہوں، تم لوگ ان کا مرتبہ پہچانو۔ اے لوگو! اللہ جل شانہٗ نے بدر کی لڑائی میں شریک ہونے والوں کی اور حدیبیہ کی لڑائی میں شریک ہونے والوں کی مغفرت فرما دی۔ تم میرے صحابہ کے بارے میں میری رعایت کیا کرو اور ان لوگوں کے بارے میں جن کی بیٹیاں میرے نکاح میں ہیں یا میری بیٹیاں ان کے نکاح میں ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ قیامت میں تم سے کسی قسم کے ظلم کا مطالبہ کریں کہ وہ معاف نہیں کیا جائے گا۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ میرے صحابہ اور میرے دامادوں میں میری رعایت کیا کرو، جو شخص ان کے بارے میں میری رعایت کرے گا اللہ تعالیٰ شانہٗ دنیا اور آخرت میں اس کی حفاظت فرمائیں گے اور جو ان کے بارے میں میری رعایت نہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے بَری ہیں اور جس سے اللہ تعالیٰ بَری ہیں کیا بعید ہے کہ کسی گرفت میں آجائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص صحابہ کے بارے میں میری رعایت کرے گا میں قیامت کے دن اس کا محافظ ہونگا۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ جو میرے صحابہ کے بارے میں میری

رعایت رکھے گا وہ میرے پاس حوضِ کوثر پر پہنچ سکے گا اور جو ان کے بارے میں میری رعایت نہ کرے گا وہ میرے پاس حوض تک نہیں پہنچ سکے گا اور مجھے دور ہی سے دیکھے گا۔ سہل بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعظیم نہ کرے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر ایمان نہیں لایا۔ اللہ جَلَّ شَانُہٗ اپنے لطف و فضل سے اپنی گرفت سے اور اپنے محبوب کے عِتاب سے مجھ کو اور میرے دوستوں کو، میرے مُحسنوں کو اور ملنے والوں کو، میرے مشائخ کو، تلامذہ کو اور سب مؤمنین کو محفوظ رکھے اور ان حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی محبّت سے ہمارے دلوں کو بھر دے۔

اٰمِیْنُ بِرَحْمَتِكَ یَآ اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ الْاَتَمَّانِ الْاَكْمَلَانِ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاهِرِیْنَ وَعَلٰی اَتْبَاعِهٖ وَ اَتْبَاعِهِمْ حَمَلَةِ الدِّیْنِ الْمَتِیْنِ . تَمَّتْ

زکریا عفی عنہ کاندھلوی
مقیم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور
۱۲ شوال ۱۳۵۷ھ دوشنبہ

فضائلِ قرآن مجید

تالیف

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس اللہ سرہ

مکتبۃ البشریٰ
کراچی - پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ الْاِنْسَانَ
وَعَلَّمَهُ الْبَیَانَ وَاَنْزَلَ لَهُ الْقُرْاٰنَ
وَجَعَلَهٗ مَوْعِظَةً وَّشِفَاءً وَّهُدًی
وَّرَحْمَةً لِّذَوِی الْاِیْمَانِ لَا رَیْبَ فِیْهِ
وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا وَّاَنْزَلَهٗ قَیِّمًا
حُجَّةً نُوْرًا لِّذَوِی الْاِیْقَانِ، وَالصَّلٰوةُ
وَالسَّلَامُ الْاَتَمَّانِ الْاَکْمَلَانِ عَلٰی
خَیْرِ الْخَلَائِقِ مِنَ الْاِنْسِ وَالْجَآنِّ
الَّذِیْ نَوَّرَ الْقُلُوْبَ وَالْقُبُوْرَ نُوْرُهٗ،
وَرَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ ظُهُوْرُهٗ، وَعَلٰی
اٰلِهٖ وَصَحْبِهِ الَّذِیْنَ هُمْ نُجُوْمُ
الْهِدَایَةِ وَنَاشِرُوا الْفُرْقَانِ، وَعَلٰی
مَنْ تَبِعَهُمْ بِالْاِیْمَانِ، وَبَعْدُ فَیَقُوْلُ
الْمُفْتَقِرُ اِلٰی رَحْمَةِ رَبِّهِ الْجَلِیْلِ،
عَبْدُهُ الْمَدْعُوُّ بِزَکَرِیَّا بْنِ یَحْیٰی بْنِ
اِسْمٰعِیْلَ: هٰذِهِ الْعُجَالَةُ اَرْبَعُوْنَةٌ فِیْ
فَضَائِلِ الْقُرْاٰنِ، اَلَّفْتُهَا مُمْتَثِلًا لِاَمْرِ
مَنْ اِشَارَتُهٗ حُکْمٌ وَّ طَاعَتُهٗ غُنْمٌ.

تمام تعریف اس پاک ذات کے لئے ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو وضاحت سکھائی اور اس کے لئے وہ قرآنِ پاک نازل فرمایا جس کو نصیحت اور شفا اور ہدایت اور رحمت ایمان والوں کے لئے بنایا جس میں نہ کوئی شک ہے اور نہ کسی قسم کی کجی، بلکہ وہ بالکل مستقیم ہے اور حجّت و نور ہے یقین والوں کے لئے، اور کامل و مکمّل درود وسلام اس بہترین خلائق پر ہوجیو، جس کے نور نے زندگی میں دلوں کو اور مرنے کے بعد قبروں کو منور فرما دیا اور جس کا ظہور تمام عالم کیلئے رحمت ہے اور آپ ﷺ کی اولاد اور اصحاب رضی اللہ عنہم پر جو ہدایت کے ستارے ہیں اور کلامِ پاک کے پھیلانے والے، نیز اُن مؤمنین پر بھی جو ایمان کے ساتھ ان کے پیچھے لگنے والے ہیں۔ حمد وصلوٰۃ کے بعد اللہ کی رحمت کا محتاج بندہ زکریا بن یحیٰ بن اسمٰعیل عرض کرتا ہے کہ یہ جلدی میں لکھے ہوئے چند اوراق ''فضائلِ قرآن'' میں ایک چہل حدیث ہے جس کو میں نے ایسے حضرات کے امتثالِ حکم میں جمع کیا ہے جن کا اشارہ بھی حکم ہے اور ان کی اطاعت ہر طرح مُغْتَنَم ہے۔

حق سبحانہٗ وَ تقدّس کے ان انعاماتِ خاصّہ میں سے جو (مدرسہ عالیہ مظاہر علوم سہارنپور) کے ساتھ ہمیشہ مخصوص رہے۔ مدرسہ کا سالانہ جلسہ ہے جو ہر سال مدرسہ کے اجمالی حالات سنانے کے لئے منعقد ہوتا ہے۔ مدرسے کے اس جلسہ میں مقرّرین، واعظین اور مَشاہیر اہلِ ہند کے جمع کرنے کا اس قدر اہتمام نہیں کیا جاتا جتنا کہ اللہ والے، قلوب والے، گمنامی میں رہنے والے مشائخ کے اجتماع کی سعی کی جاتی ہے۔ وہ زمانہ اگرچہ کچھ دور ہو گیا ہے جب کہ حُجّۃ الاِسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قَدَّسَ اللہ سرَّہٗ الْعَزِیز اور قُطبُ الارشاد حضرت اقدس مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی نَوَّرَ اللہ مَرقدَہٗ کی تشریف آوری حاضرینِ جلسہ کے قلوب کو منور فرمایا کرتی تھی، مگر وہ منظر ابھی آنکھوں سے زیادہ دور نہیں ہوا جب کہ ان مجدّدِ دینِ اسلام اور شموسِ ہدایت کے جانشین حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب نَوَّرَ اللہ مَرقدَہٗ مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں مُجتمع ہو کر مردہ قلوب کے لئے زندگی و نورانیت کے لئے چشمے جاری فرمایا کرتے تھے اور عشق کے پیاسوں کو سیراب فرماتے تھے۔

دورِ حاضر میں مدرسے کا جلسہ اُن بُدورِ ہدایت سے بھی گو محروم ہو گیا، مگر ان کے سچے جانشین حُضّارِ جلسہ کو اب بھی اپنے فیوض و برکات سے مالا مال فرماتے ہیں۔ جو لوگ اِمسال جلسے میں شریک رہے ہیں وہ اس کے لئے شاہدِ عدل ہیں، آنکھوں والے برکات دیکھتے ہیں، لیکن ہم سے بے بَصر بھی اتنا ضرور محسوس کرتے ہیں کہ کوئی بات ضرور ہے۔

مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں اگر کوئی شخص شُستہ تقاریر، زوردار لیکچروں کا طالب بن کر آئے تو شاید وہ اتنا مسرور نہ جائے جس قدر کہ دوائے دل کا طالب کامگار[1] و فیض یاب جائے گا۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃُ۔

اسی سلسلہ میں سالِ رواں ۲۷ ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ کے جلسہ میں حضرت الشاہ حافظ محمد یٰسین صاحب نگینوی رحمۃ اللہ علیہ نے قدم رنجہ فرما کر اس سیہ کار پر جس قدر شفقت و لطف کا مینہ برسایا، یہ ناکارہ اس کے تشکر سے بھی قاصر ہے۔ ممدوح کے متعلق یہ معلوم ہو جانے کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے ہیں پھر آپ کے اوصافِ جلیلہ: یک سوئی،

---

[1] کامگار:- خوش نصیب، اقبال مند

تقدّس، مَظہرِ انوار و برکات وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔ جلسہ سے فراغت کے بعد ممدوح جب مکان واپس تشریف لے گئے تو گرامی نامہ، مَکَرّمَت نامہ، عزت نامہ سے مجھے اس کا حکم فرمایا کہ فضائل قرآن میں ایک چہل حدیث جمع کر کے اس کا ترجمہ خدمت میں پیش کروں اور نیز یہ کہ اگر ممدوح کے حکم سے میں نے انحراف کیا تو وہ میرے جانشینِ شیخ اور مَثِیلِ والد چچا جان مولانا الحافظ الحاج مولوی محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے اپنے اس حکم کو مؤکد کرائیں گے اور بہر حال یہ خدمت ممدوح کو مجھ جیسے ناکارہ ہی سے لینا ہے۔ یہ افتخار نامہ اتفاقاً ایسی حالت میں پہنچا کہ میں سفر میں تھا اور میرے چچا جان یہاں تشریف فرما تھے، انہوں نے میری واپسی پر یہ گرامی نامہ اپنے تاکیدی حکم کے ساتھ میرے حوالے فرمایا کہ جس کے بعد نہ مجھے کسی معذرت کی گنجائش رہی اور نہ اپنی عدم اہلیت کے پیش کرنے کا موقع رہا۔ میرے لئے شرحِ مُوَطّا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مشغولیت بھی ایک قوی عذر تھا، مگر ارشاداتِ عالیہ کی اہمیّت کی وجہ سے اس کو چندروز کے لئے ملتوی کر کے ماحضر خدمات عالیہ میں پیش کرتا ہوں اور ان لغزشوں سے جن کا وجود میری نااہلیت کے لئے لازم ہے معافی کا خواستگار ہوں۔

رَجَاءَ الْحَشْرِ فِیْ سِلْكِ مَنْ قَالَ فِیْهِمُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ: "مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ اَرْبَعِیْنَ حَدِیْثًا فِیْ اَمْرِ دِیْنِهَا بَعَثَهُ اللّٰهُ فَقِیْهًا وَكُنْتُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ شَافِعًا وَّشَهِیْدًا". قَالَ الْعَلْقَمِیُّ رحمه الله: اَلْحِفْظُ ضَبْطُ الشَّیْءِ وَمَنْعُهٗ مِنَ الضِّیَاعِ، فَتَارَةً یَكُوْنُ حِفْظُ الْعِلْمِ بِالْقَلْبِ وَ اِنْ لَّمْ یَكْتُبْ، وَتَارَةً فِی الْكِتَابِ وَاِنْ لَّمْ یَحْفَظْهُ بِقَلْبِهٖ، فَلَوْ حَفِظَ فِیْ كِتَابٍ ثُمَّ نَقَلَ اِلَی النَّاسِ دَخَلَ فِیْ وَعْدِ الْحَدِیْثِ. وَقَالَ الْمُنَاوِیُّ رحمه الله: قَوْلُهٗ مَنْ حَفِظَ عَلٰی اُمَّتِیْ اَیْ نَقَلَ اِلَیْهِمْ

اس جماعت کے ساتھ حشر ہونے کی امید میں جن کے بارے میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص میری امت کے لئے ان کے دینی امور میں چالیس حدیثیں محفوظ کرے گا حق تعالیٰ شانہٗ اس کو قیامت میں عالم اٹھائے گا اور میں اس کے لئے سفارشی اور گواہ بنوں گا۔ علقمی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ محفوظ کرنا شے کے مُنضَبِط کرنے اور ضائع ہونے سے حفاظت کا نام ہے، چاہے بغیر لکھے برزبان یاد کرلے یا لکھ کر محفوظ کرلے اگرچہ یاد نہ ہو، پس اگر کوئی شخص کتاب میں لکھ کر دوسروں تک پہنچا دے

بِطَرِيْقِ التَّخْرِيْجِ وَالْاِسْنَادِ، وَقِيْلَ: مَعْنٰى "حَفِظَهَا" اَنْ يَنْقُلَهَا اِلَى الْمُسْلِمِيْنَ وَ اِنْ لَّمْ يَحْفَظْهَا وَلَا عَرَفَ مَعْنَاهَا، وَقَوْلُهٗ: اَرْبَعِيْنَ حَدِيْثًا، صِحَاحًا اَوْحِسَانًا، قِيْلَ: اَوْضِعَافًا يُعْمَلُ بِهَا فِي الْفَضَائِلِ، فَلِلّٰهِ دَرُّ الْاِسْلَامِ مَا اَيْسَرَهٗ، وَلِلّٰهِ دَرُّ اَهْلِهٖ مَا اَجْوَدَ مَا اسْتَنْبَطُوْا، رَزَقَنِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاِيَّاكُمْ كَمَالَ الْاِسْلَامِ، وَ مِمَّا لَابُدَّ مِنَ التَّنْبِيْهِ عَلَيْهِ اَنِّيْ اعْتَمَدْتُّ فِي التَّخْرِيْجِ عَلَى الْمِشْكٰوةِ وَتَخْرِيْجِهٖ وَشَرْحِهِ الْمِرْقَاةِ، وَ شَرْحِ الْاِحْيَاءِ لِلسَّيِّدِ مُحَمَّدِنِ الْمُرْتَضٰى، وَالتَّرْغِيْبِ لِلْمُنْذِرِيِّ وَ مَا عَزَوْتُ اِلَيْهَا لِكَثْرَةِ الْاَخْذِ عَنْهَا، وَمَا اَخَذْتُ عَنْ غَيْرِهَا عَزَوْتُهٗ اِلٰى مَاْخَذِهٖ، وَيَنْبَغِيْ لِلْقَارِئِ مُرَاعَاةُ اٰدَابِ التِّلَاوَةِ عِنْدَ الْقِرَاءَةِ.

وہ بھی حدیث کی بشارت میں داخل ہوگا۔ مُناوِی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں میری امت پر محفوظ کر لینے سے مراد ان کی طرف نقل کرنا ہے سَنَد کے حوالے کے ساتھ اور بعض نے کہا ہے کہ مسلمانوں تک پہنچانا ہے اگرچہ وہ برزبان یاد نہ ہوں، نہ ان کے معنی معلوم ہوں۔ اسی طرح چالیس حدیثیں بھی عام ہیں کہ سب صحیح ہوں یا حَسن یا معمولی درجہ کی ضعیف جن پر فضائل میں عمل جائز ہو۔ اللہ اکبر! اسلام میں بھی کیا کیا سہولتیں ہیں اور تعجب کی بات ہے کہ علماء نے بھی کس قدر باریکیاں نکالی ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ کمالِ اسلام مجھے بھی نصیب فرماویں اور تمہیں بھی۔ اس جگہ ایک ضروری امر پر متنبہ کرنا بھی لابدّی ہے، وہ یہ کہ میں نے احادیث کا حوالہ دینے میں مشکوٰۃ، تنقیح الرُّواۃ، مِرقاۃ اور احیاء العلوم کی شرح اور مُنذری رحمۃ اللہ علیہ کی ترغیب پر اعتماد کیا ہے اور کثرت سے ان سے لیا ہے، اس لئے ان کے حوالے کی ضرورت نہیں سمجھی، البتہ ان کے علاوہ کہیں سے لیا ہے تو اس کا حوالہ نقل کر دیا، نیز قاری کے لئے تلاوت کے وقت اس کے آداب کی رعایت بھی ضروری ہے۔

مقصود سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ مجید پڑھنے کے کچھ آداب بھی لکھ دیئے جائیں کہ

ع بےادب محروم گشت از فضلِ رب

مختصر طور پر آداب کا خلاصہ یہ ہے، کلام اللہ شریف معبود کا کلام ہے، محبوب و مطلوب کے فرمودہ الفاظ ہیں۔

جن لوگوں کو محبّت سے کچھ واسطہ پڑا ہے وہ جانتے ہیں کہ معشوق کے خط کی، محبوب کی تقریر وتحریر کی کسی دل کھوئے ہوئے کے یہاں کیا وَقعت ہوتی ہے، اس کے ساتھ جو شیفتگی و فریفتگی کا معاملہ ہوتا ہے اور ہونا چاہئے وہ قواعد وضوابط سے بالاتر ہے

ع محبّت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

اس وقت اگر جمالِ حقیقی اور انعامات غیر مُتناہی کا تصور ہو تو محبّت موج زن[1] ہوگی، اس کے ساتھ ہی وہ اَحکمُ الحاکمین کا کلام ہے، سلطانُ السلاطین کا فرمان ہے، اس سَطوَت وجَبَروت والے بادشاہ کا قانون ہے کہ جس کی ہمسری نہ کسی بڑے سے بڑے سے ہوئی اور نہ ہوسکتی ہے۔ جن لوگوں کو سلاطین کے دربار سے کچھ واسطہ پڑ چکا ہے وہ تجربے سے اور جن کو سابقہ نہیں پڑا وہ اندازہ کرسکتے ہیں کہ سلطانی فرمان کی ہیبت قلوب پر کیا ہوسکتی ہے۔ کلامِ الٰہی محبوب وحاکم کا کلام ہے، اس لئے دونوں آداب کا مجموعہ اس کے ساتھ برتنا ضروری ہے۔

حضرت عِکرِمہ رحمۃ اللہ علیہ جب کلامِ پاک پڑھنے کے لئے کھولا کرتے تھے تو بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے اور زبان پر جاری ہوجاتا تھا "هٰذَا كَلَامُ رَبِّيْ، هٰذَا كَلَامُ رَبِّيْ" (یہ میرے رب کا کلام ہے یہ میرے رب کا کلام ہے) یہ ان آداب کا اِجمال ہے اور ان تفصیلات کا اِختصار ہے جو مشائخ رحمۃ اللہ علیہم نے آدابِ تلاوت میں لکھے ہیں جن کی کسی قدر توضیح بھی ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، جن کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ بندہ نوکر بن کر نہیں، چاکر بن کر نہیں، بلکہ بندہ بن کر آقا و مالک، مُحسن و مُنعِم کا کلام پڑھے، صوفیاء نے لکھا ہے کہ جو شخص اپنے کو قراءت کے آداب سے قاصر سمجھتا رہے گا وہ قرب کے مراتب میں ترقی کرتا رہے گا اور جو اپنے کو رضا وعُجب کی نگاہ سے دیکھے گا وہ ترقی سے دور ہوگا۔

---

[1] موج زن:- ٹھاٹھیں مارنے والا

آداب

مسواک اور وضو کے بعد کسی یک سوئی کی جگہ میں نہایت وقار وتواضع کے ساتھ رو بہ قبلہ بیٹھے اور نہایت ہی حضورِ قلب اور خشوع کے ساتھ اس لطف سے جو اس وقت کے مناسب ہے اس طرح پڑھے کہ گویا خود حق سبحانہٗ وعَزَّ اِسمُہٗ کو کلامِ پاک سنا رہا ہے۔ اگر وہ معنیٰ سمجھتا ہے تو تدبّر و تفکّر کے ساتھ آیاتِ وعدۂ رحمت پر دعائے مغفرت ورحمت مانگے اور آیاتِ عذاب ووعید پر اللہ سے پناہ چاہے کہ اس کے سوا کوئی بھی چارہ ساز نہیں۔ آیاتِ تنزیہ وتقدیس پر سُبحَانَ اللّٰہِ کہے اور از خود تلاوت میں رونا نہ آوے تو بتکلّف رونے کی سعی کرے۔

وَاَلَذُّ حَالَاتِ الْغَرَامِ لِمُغْرِمٍ شَكْوَى الْهَوٰى بِالْمُدْمَعِ الْمُهْرَاقِ

ترجمہ: کسی عاشق کے لئے سب سے زیادہ لذت کی حالت یہ ہے کہ محبوب سے اس کا گِلہ ہو رہا ہو اس طرح کہ آنکھوں سے بارش ہو۔

پس اگر یاد کرنا مقصود نہ ہو تو پڑھنے میں جلدی نہ کرے، کلامِ پاک کو رحل یا تکیہ یا کسی اونچی جگہ پر رکھے، تلاوت کے درمیان میں کسی سے کلام نہ کرے، اگر کوئی ضرورت پیش ہی آجاوے تو کلامِ پاک بند کر کے بات کرے اور پھر اس کے بعد "اَعُوْذُ" پڑھ کر دوبارہ شروع کرے، اگر مجمع میں لوگ اپنے اپنے کاروباروں میں مشغول ہوں تو آہستہ پڑھنا افضل ہے، ورنہ آواز سے پڑھنا اولیٰ ہے۔ مشائخ نے تلاوت کے چھ آداب ظاہری اور چھ باطنی ارشاد فرمائے ہیں۔

ظاہری آداب: اوّل: غایتِ احترام سے باوضو، رو بہ قبلہ بیٹھے۔ دوم: پڑھنے میں جلدی نہ کرے، ترتیل وتجوید سے پڑھے۔ سوم: رونے کی سعی کرے، چاہے بتکلّف ہی کیوں نہ ہو۔ چہارم: آیاتِ رحمت وآیاتِ عذاب کا حق ادا کرے جیسا کہ پہلے گذر چکا۔ پنجم: اگر ریا کا احتمال ہو یا کسی دوسرے مسلمان کی تکلیف وحرج کا اندیشہ ہو تو آہستہ پڑھے ورنہ آواز سے۔ ششم: خوش اِلحانی سے پڑھے کہ خوش الحانی سے کلامِ پاک پڑھنے کی بہت سی احادیث میں تاکید آئی ہے۔

باطنی آداب: اوّل: کلامِ پاک کی عظمت دل میں رکھے کہ کیسا عالی مرتبہ کلام ہے۔ دوم: حق سبحانہ و تقدس کی عُلوِّ شان اور رِفعت و کبریائی کو دل میں رکھے جس کا کلام ہے۔ سوم: دل کو وساوس وخطرات سے پاک رکھے۔ چہارم: معانی کا تدبر کرے اور لذت کیساتھ پڑھے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ایک شب تمام رات اس آیت کو پڑھ کر گذار دی:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (المائدة: ١٦٤)

اے اللہ! اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر مغفرت فرما دے تو تُو عزت وحکمت والا ہے۔

سعید بن جُبَیر رحمۃ اللہ علیہ نے ایک رات اس آیت کو پڑھ کر صبح کر دی:

وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ (یٰس: ٥٩)

او مجرمو! آج قیامت کے دن فرماں برداروں سے الگ ہو جاؤ۔

پنجم: جن آیات کی تلاوت کر رہا ہے دل کو ان کے تابع بناوے مثلاً اگر آیتِ رحمت زبان پر ہے، دل سُرُورِ محض بن جائے اور آیتِ عذاب اگر آ گئی ہے تو دل لرز جائے۔
ششم: کانوں کو اس درجہ متوجہ بنا دے کہ گویا خود حق سبحانہٗ وتَقَدَّس کلام فرما رہے ہیں اور یہ سن رہا ہے حق تعالیٰ شانہٗ محض اپنے لطف وکرم سے مجھے بھی ان آداب کے ساتھ پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے اور تمہیں بھی۔

مسئلہ: اتنے قرآن شریف کا حفظ کرنا جس سے نماز ادا ہو جائے ہر شخص پر فرض ہے اور تمام کلامِ پاک کا حفظ کرنا فرض کفایہ ہے، اگر کوئی بھی اَلْعِیاذ باللہ حافظ نہ رہے تو تمام مسلمان گناہ گار ہیں بلکہ زَرکشی رحمۃ اللہ علیہ سے ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ جس شہر یا گاؤں میں کوئی قرآن پاک پڑھنے والا نہ ہو تو سب گناہ گار ہیں۔ اس زمانۂ ضلالت و جہالت میں جہاں ہم مسلمانوں میں اور بہت سے دینی امور میں گمراہی پھیل رہی ہے وہاں ایک عام آوازہ یہ بھی ہے کہ قرآن شریف کے حفظ کرنے کو فضول سمجھا جا رہا ہے، اس کے الفاظ رٹنے کو حماقت بتلایا جاتا ہے، اس کے الفاظ یاد کرنے کو دماغ سوزی اور تضییعِ اوقات کہا جاتا ہے، اگر ہماری بد دینی کی یہی ایک وبا ہوتی تو اس پر کچھ تفصیل سے لکھا جاتا، مگر یہاں

ہر ادا مرض ہے اور ہر خیال باطل ہی کی طرف کھینچتا ہے۔ اس لئے کس کس چیز کو روئیے اور کس کس کا شکوہ کیجئے۔ فَإِلَى اللّٰهِ الْمُشْتَكٰى وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔

(۱) عَنْ عُثْمَانَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: خَيْرُكُمْ مَّنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ. (رواه البخاری و ابوداود و الترمذی والنسائی وابن ماجة، هكذا فی الترغيب و عزاه الیٰ مسلم ايضاً، لكن حكی الحافظ فی الفتح عن ابی العلاءِ أنّ مسلمًا سكت عنه)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

اکثر کتب میں یہ روایت ''واو'' کے ساتھ ہے جس کا ترجمہ لکھا گیا، اس صورت میں فضیلت اس شخص کے لئے ہے جو کلامِ پاک سیکھے اور اس کے بعد دوسروں کو سکھائے، لیکن بعض کتب میں یہ روایت ''او'' کے ساتھ وارد ہوئی ہے، اس صورت میں بہتری اور فضیلت عام ہوگی کہ خود سیکھے یا دوسروں کو سکھائے، دونوں کے لئے مستقل خیر و بہتری ہے۔

کلامِ پاک چونکہ اصلِ دین ہے اس کی بقا و اشاعت پر ہی دین کا مدار ہے، اس لئے اس کے سیکھنے اور سکھانے کا افضل ہونا ظاہر ہے، کسی توضیح کا محتاج نہیں، البتہ اس کی انواع مختلف ہیں، کمال اس کا یہ ہے کہ مطالب و مقاصد سمیت سیکھے اور ادنیٰ درجہ اس کا یہ ہے کہ فقط الفاظ سیکھے۔ نبیِ کریم ﷺ کا دوسرا ارشاد حدیثِ مذکور کی تائید کرتا ہے جو سعید بن سلیم رحمۃ اللہ علیہ سے مُرسَلاً منقول ہے کہ جو شخص قرآن شریف کو حاصل کرلے اور پھر کسی دوسرے شخص کو جو کوئی اور چیز عطا کیا گیا ہو اپنے سے افضل سمجھے تو اس نے حق تعالیٰ شانہٗ کے اس انعام کی جو اپنے کلامِ پاک کی وجہ سے اس پر فرمایا ہے تحقیر کی ہے اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جب کلامِ الٰہی سب کلاموں سے افضل ہے جیسا کہ مستقل احادیث میں آنے والا ہے تو اس کا پڑھنا پڑھانا یقیناً سب چیزوں سے افضل ہونا ہی چاہئے۔ ایک دوسری حدیث میں ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ جس شخص نے کلامِ پاک کو حاصل کرلیا اس نے علومِ نبوت کو اپنی پیشانی میں جمع کرلیا۔ سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ اس کے کلامِ پاک کی محبت قلب میں ہو۔ شرحِ احیاء میں ان لوگوں کی

فہرست میں جو قیامت کے ہولناک دن میں عرش کے سایہ کے نیچے رہیں گے ان لوگوں کو بھی شمار کیا ہے جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآنِ پاک کی تعلیم دیتے ہیں، نیز ان لوگوں کو بھی شمار کیا ہے جو بچپن میں قرآن شریف سیکھتے ہیں اور بڑے ہو کر اس کی تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں۔

(۲) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: یَقُوْلُ الرَّبُّ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی: مَنْ شَغَلَہُ الْقُرْاٰنُ عَنْ ذِکْرِیْ وَمَسْئَلَتِیْ، اَعْطَیْتُہٗ اَفْضَلَ مَا اُعْطِی السَّائِلِیْنَ، وَفَضْلُ کَلَامِ اللّٰہِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰہِ عَلٰی خَلْقِہٖ۔ (رواہ الترمذی والدارمی والبیهقی فی الشعب)

ابو سعید رضی اللہ عنہ سے حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ حق سبحانہٗ وتقدّس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہٗ کے کلام کو سب کلاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہٗ کو تمام مخلوق پر۔

یعنی جس شخص کو قرآنِ پاک کے یاد کرنے یا جاننے اور سمجھنے میں اس درجہ مشغولی ہے کہ کسی دوسری دعا وغیرہ کے مانگنے کا وقت نہیں ملتا، میں دعا مانگنے والوں کے مانگنے سے بھی افضل چیز اس کو عطا کروں گا۔ دنیا کا مشاہدہ ہے کہ جب کوئی شخص شیرینی وغیرہ تقسیم کر رہا ہو اور کوئی مٹھائی لینے والا اس کے ہی کام میں مشغول ہو اور اس کی وجہ سے نہ آ سکتا ہو تو یقیناً اس کا حصّہ پہلے ہی نکال لیا جاتا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں اسی موقع پر مذکور ہے کہ میں اس کو شکر گذار بندوں کے ثواب سے افضل ثواب عطا کروں گا۔

(۳) عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَنَحْنُ فِی الصُّفَّةِ، فَقَالَ: اَیُّکُمْ یُحِبُّ اَنْ یَّغْدُوَ کُلَّ یَوْمٍ اِلٰی بُطْحَانَ اَوِ الْعَقِیْقِ، فَیَاْتِیَ

عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے، ہم لوگ صفہ میں بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کون شخص اس کو پسند کرتا ہے کہ علی الصبح بازار

بِنَاقَتَيْنِ كَوْمَاوَيْنِ، فِي غَيْرِ اِثْمٍ وَلَا قَطِيْعَةِ رَحِمٍ؟ فَقُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! كُلُّنَا نُحِبُّ ذٰلِكَ، قَالَ: اَفَلَا يَغْدُوْاَحَدُ كُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ، فَيُعَلِّمُ اَوْيَقْرَأُ اٰيَتَيْنِ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ نَّاقَتَيْنِ، وَثَلٰثٌ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ ثَلٰثٍ، وَاَرْبَعٌ خَيْرٌ لَّهٗ مِنْ اَرْبَعٍ وَمِنْ اَعْدَادِ هِنَّ مِنَ الْاِبِلِ. (رواه مسلم و أبو داؤد)

''بُطحان'' یا ''عَقِیق'' میں جاوے اور دو اونٹنیاں عمدہ سے عمدہ بلا کسی قسم کے گناہ اور قطع رحمی کے پکڑ لائے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اس کو تو ہم میں سے ہر شخص پسند کرے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسجد میں جا کر دو آیتوں کا پڑھنا یا پڑھا دینا دو اونٹنیوں سے اور تین آیات کا تین اونٹنیوں سے، اسی طرح چار کا چار سے افضل ہے اور ان کے برابر اونٹوں سے افضل ہے۔

''صُفّہ'' مسجد نبوی میں ایک خاص مُعیّن چبوترہ کا نام ہے جو فقراءِ مہاجرین کی نشست گاہ تھی، اصحابِ صفہ کی تعداد مختلف اوقات میں کم وبیش ہوتی رہتی تھی۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سو ایک نام گنوائے ہیں اور مستقل رسالہ ان کے اسماءِ گرامی میں تصنیف کیا ہے۔ بطحان اور عقیق مدینہ طیّبہ کے پاس دو جگہ ہیں جہاں اونٹوں کا بازار لگتا تھا۔ عرب کے نزدیک اونٹ نہایت پسندیدہ چیز تھی، بالخصوص وہ اونٹنی جس کا کوہان فربہ ہو۔ بغیر گناہ کا مطلب یہ ہے کہ بے محنت چیز اکثر یا چھین کر کسی سے لی جاتی ہے یا یہ کہ میراث وغیرہ میں کسی رشتہ دار کے مال پر قبضہ کرلے یا کسی کا مال چرالے، اس لئے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کی نفی فرمادی کہ بالکل بلا مشقت اور بدون کسی گناہ کے حاصل کر لینا جس قدر پسندیدہ ہے اس سے زیادہ بہتر و افضل ہے چند آیات کا حاصل کر لینا اور یہ یقینی امر ہے کہ ایک دو اونٹ درکنار ہفت اقلیم کی سلطنت بھی اگر کسی کو مل جاوے تو کیا، آج نہیں تو کل موت اس سے جبراً جدا کر دے گی، لیکن ایک آیت کا اجر ہمیشہ کے لئے ساتھ رہنے والی چیز ہے۔ دنیا ہی میں دیکھ لیجئے کہ آپ کسی شخص کو ایک روپیہ عطا فرمادیجئے، اس کی اس کو مسرت ہوگی بمقابلہ اس کے کہ ایک ہزار روپیہ اس کے حوالے کردیں کہ اس کو اپنے پاس رکھ لے، میں ابھی واپس آکر لے لوں گا کہ اس صورت میں بجز اس پر بارِ امانت کے اور کوئی فائدہ اس کو حاصل نہیں ہوگا۔

درحقیقت اس حدیث شریف میں فانی و باقی کے تقابل پر تنبیہ بھی مقصود ہے کہ آدمی اپنی حرکت وسکون پر غور کرے کہ کسی فانی چیز پر اس کو ضائع کر رہا ہوں یا باقی رہنے والی چیز پر، اور پھر حسرت ہے ان اوقات پر جو باقی رہنے والا وبال کماتے ہوں۔

حدیث کا اخیر جملہ ''اوران کے برابر اونٹوں سے افضل ہے''۔ تین مطالب کا محتمل ہے: اول یہ کہ چار کے عدد تک بالتفصیل ارشاد فرمایا اوراس کے مافوق (زیادہ) کو اجمالاً فرمادیا کہ جس قدر آیات کوئی شخص حاصل کرے گا اس کے بقدر اونٹوں سے افضل ہے۔ اس صورت میں اونٹوں سے جنس مراد ہے خواہ اونٹ ہوں یا اونٹنیاں اور بیان ہے چار سے زیادہ کا، اس لئے کہ چار تک کا ذکر خود تصریحاً مذکور ہو چکا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انہیں اعداد کا ذکر ہے جو پہلے مذکور ہو چکے، اور مطلب یہ ہے کہ رغبات مختلف ہوا کرتی ہیں: کسی کو اونٹنی پسند ہے تو کوئی اونٹ کا گرویدہ ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لفظ سے یہ ارشاد فرمایا کہ ہر آیت ایک اونٹنی سے بھی افضل ہے اور اگر کوئی شخص اونٹ سے محبّت رکھتا ہو تو ایک آیت ایک اونٹ سے بھی افضل ہے۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ یہ بیان انہی اعداد کا ہے جو پہلے ذکر کئے گئے، چار سے زائد کا نہیں ہے، مگر دوسرے مطلب میں جو تقریر گذری کہ ایک اونٹنی یا ایک اونٹ سے افضل ہے، یہ نہیں بلکہ مجموعہ مراد ہے کہ ایک آیت ایک اونٹ اور ایک اونٹنی دونوں کے مجموعہ سے افضل ہے۔ اسی طرح ہر آیت اپنے موافق عدد اونٹنی اور اونٹ دونوں کے مجموعے سے افضل ہے تو گویا فی آیت کا مقابلہ ایک جوڑا سے ہوا۔ میرے والد صاحب نَوَّرَ اللّٰہ مَرقَدَہٗ نے اسی مطلب کو پسند فرمایا ہے کہ اس میں فضیلت کی زیادتی ہے، اگر چہ یہ مراد نہیں کہ ایک آیت کا اجر ایک اونٹ یا دو اونٹ کا مقابلہ کر سکتا ہے، یہ صرف تنبیہ اور تمثیل ہے، میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ایک آیت جس کا ثواب دائمی اور ہمیشہ رہنے والا ہے، ہفت اقلیم کی بادشاہت سے جو فنا ہو جانے والی ہے افضل اور بہتر ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک بزرگ کے بعض تجارت پیشہ احباب نے ان سے درخواست کی کہ جہاز سے اترنے کے وقت حضرت جدہ تشریف فرما ہوں تا کہ جناب کی برکت سے ہمارے مال میں نفع ہو اور مقصود یہ تھا کہ تجارت کے منافع سے حضرت کے بعض خدام کو کچھ نفع حاصل ہو۔ اوّل تو حضرت نے عذر فرمایا، مگر جب انہوں نے اصرار کیا

تو حضرت نے دریافت فرمایا کہ تمہیں زائد سے زائد جو نفع مالِ تجارت میں ہوتا ہے وہ کیا مقدار ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ مختلف ہوتا ہے، زائد سے زائد ایک کے دو ہو جاتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ ''اس قلیل نفع کے لئے اس قدر مشقت اٹھاتے ہو؟ اتنی سی بات کے لئے ہم حرم محترم کی نماز کیسے چھوڑ دیں جہاں ایک کے لاکھ ملتے ہیں۔'' درحقیقت مسلمانوں کے غور کرنے کی جگہ ہے کہ وہ ذرا سی دنیوی متاع کی خاطر کس قدر دینی منافع کو قربان کر دیتے ہیں۔

(۴) عَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْاٰنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ، وَالَّذِیْ یَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَیَتَتَعْتَعُ فِیْهِ وَهُوَ عَلَیْهِ شَاقٌّ لَهٗ اَجْرَانِ. (رواه البخاری ومسلم و ابوداود والترمذی والنسائی و ابن ماجة)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ قرآن کا ماہر اُن ملائکہ کے ساتھ ہے جو میرمنشی ہیں اور نیک کار ہیں اور جو شخص قرآن شریف کو اٹکتا ہوا پڑھتا ہے اور اس میں دِقت اٹھاتا ہے اس کو دوہرا اجر ہے۔

قرآن شریف کا ماہر وہ کہلاتا ہے جس کو یاد بھی خوب ہو اور پڑھتا بھی خوب ہو اور اگر معانی و مراد پر بھی قادر ہو تو پھر کیا کہنا۔ ملائکہ کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی قرآن شریف کے لوحِ محفوظ سے نقل کرنے والے ہیں اور یہ بھی اس کا نقل کرنے والا اور پہنچانے والا ہے تو گویا دونوں ایک ہی مَسلک پر ہیں یا یہ کہ حشر میں ان کے ساتھ اجتماع ہو گا۔ اٹکنے والے کو دوہرا اجر، ایک اس کی قراءت کا، دوسرا اس کی اس مشقت کا جو اس بار بار کے اٹکنے کی وجہ سے برداشت کرتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ اس ماہر سے بڑھ جاوے، ماہر کے لئے جو فضیلت ارشاد فرمائی گئی ہے وہ اس سے بہت بڑھ کر ہے کہ مخصوص ملائکہ کے ساتھ اس کا اجتماع فرمایا ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس کے اٹکنے کی وجہ سے اس مشقت کا اجر مستقل ملے گا، لہٰذا اس عذر کی وجہ سے کسی کو چھوڑنا نہیں چاہئے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے ''طبرانی'' اور ''بیہقی'' کی روایت سے نقل کیا ہے کہ جو شخص قرآن شریف پڑھتا ہے اور وہ یاد نہیں ہوتا تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے اور جو اس کو یاد

کرنے کی تمنّا کرتا رہے لیکن یاد کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، مگر وہ پڑھنا بھی نہیں چھوڑتا تو حق تعالیٰ شانہٗ اس کا حفاظ ہی کے ساتھ حشر فرمائیں گے۔

(۵) عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَاحَسَدَ اِلَّا عَلٰی اثْنَیْنِ: رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْاٰنَ فَهُوَ یَقُوْمُ بِهٖ اٰنَآءَ اللَّیْلِ وَ اٰنَآءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ اٰنَآءَ اللَّیْلِ وَاٰنَآءَ النَّهَارِ. (رواه البخاری والترمذی والنسائی)

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ حسد دو شخصوں کے سوا کسی پر جائز نہیں، ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس میں مشغول رہتا ہے، دوسرے وہ جس کو حق سبحانہٗ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

قرآن شریف کی آیات اور احادیث کثیرہ کے عموم سے حسد کی برائی اور ناجائز ہونا مطلقاً معلوم ہوتا ہے، اس حدیث شریف سے دو آدمیوں کے بارے میں جواز معلوم ہوتا ہے، چونکہ وہ روایات زیادہ مشہور و کثیر ہیں اس لئے علماء نے اس حدیث کے دو مطلب ارشاد فرمائے ہیں: اول یہ کہ حسد اس حدیث شریف میں رشک کے معنی میں ہے جس کو عربی میں غِبْطَہ کہتے ہیں۔ حسد اور غبطہ میں یہ فرق ہے کہ حسد میں کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے، خواہ اپنے پاس حاصل ہو یا نہ ہو اور رشک میں اپنے پاس اس کے حصول کی تمنّا و آرزو ہوتی ہے، عام ہے کہ دوسرے سے زائل ہو یا نہ ہو۔ چونکہ حسد بالاجماع حرام ہے اس لئے علماء نے اس لفظِ حسد کو مجازاً غِبْطَہ کے معنی میں ارشاد فرمایا ہے جو دنیوی امور میں مباح ہے اور دینی امور میں مستحب۔ دوسرا مطلب یہ بھی ممکن ہے کہ بسا اوقات کلام علیٰ سَبِیْلِ الفَرْضِ والتَّقْدِیْرِ مستعمل ہوتا ہے یعنی اگر حسد جائز ہوتا تو یہ دو چیزیں ایسی تھیں کہ ان میں جائز ہوتا۔

(۶) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ

ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے جو مؤمن قرآن شریف

يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ الْاُتْرُجَّةِ ،رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ، وَمَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِیْ لاَ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ التَّمْرَةِ لاَ رِيْحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ، وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ لاَيَقْرَأُ الْقُراٰنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ ،لَيْسَ لَهَا رِيْحٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ، وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِیْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ مَثَلُ الرَّيْحَانَةِ، رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ .(رواه البخاری و مسلم والنسائی و ابن ماجة)

پڑھتا ہے اس کی مثال تُرنج کی سی ہے اس کی خوشبو بھی عمدہ ہوتی ہے اور مزہ بھی لذیذ، اور جو مؤمن قرآن شریف نہ پڑھے اس کی مثال کھجور کی سی ہے کہ خوشبو کچھ نہیں مگر مزہ شیریں ہوتا ہے، اور جو منافق قرآن شریف نہیں پڑھتا، اس کی مثال حَنظَل کے پھل کی سی ہے کہ مزہ کڑوا اور خوشبو کچھ نہیں، اور جو منافق قرآن شریف پڑھتا ہے اس کی مثال خوشبودار پھول کی سی ہے کہ خوشبو عمدہ اور مزہ کڑوا۔

مقصود اس حدیث سے غیر محسوس شے کو محسوس کے ساتھ تشبیہ دینا ہے تا کہ ذہن میں فرق کلامِ پاک کے پڑھنے اور نہ پڑھنے میں سہولت سے آجاوے، ورنہ ظاہر ہے کہ کلامِ پاک کی حلاوت ومہک سے کیا نسبت ترنج وکھجور کو، اگر چہ ان اشیاء کے ساتھ تشبیہ میں خاص نکات بھی ہیں جو علومِ نبویہ سے تعلّق رکھتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کی وسعت کی طرف مشیر ہیں، مثلاً ترنج[1] ہی کو لے لیجئے، منہ میں خوشبو پیدا کرتا ہے، معدہ کو صاف کرتا ہے، ہضم میں قوت دیتا ہے وغیر وغیرہ؛ یہ منافع ایسے ہیں کہ قراءتِ قرآن شریف کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے ہیں مثلاً منہ کا خوشبودار ہونا، باطن کا صاف کرنا، روحانیت میں قوت پیدا کرنا؛ یہ منافع تلاوت میں ہیں جو پہلے منافع کے ساتھ بہت ہی مشابہت رکھتے ہیں۔ ایک خاص اثر ترنج میں یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ جس گھر میں تُرنج ہو وہاں جن نہیں رہ سکتا، اگر یہ صحیح ہے تو پھر کلامِ پاک کے ساتھ خاص مشابہت ہے، بعض اطبّا سے میں نے سنا ہے کہ تُرنج سے حافظہ بھی قوی ہوتا ہے اور حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ سے احیاء میں نقل کیا ہے کہ تین چیزیں حافظہ کو بڑھاتی ہیں:۔

(۱) مسواک (۲) روزہ (۳) تلاوتِ کلام اللہ شریف

[1] تُرنج:- چکوترا

ابوداؤد کی روایت میں اس حدیث کے ختم پر ایک مضمون نہایت ہی مفید ہے کہ بہتر ہم نشیں کی مثال مشک والے آدمی کی سی ہے، اگر تجھے مشک نہ مل سکا تو اس کی خوشبو تو کہیں گئی نہیں، اور بدتر ہم نشیں کی مثال آگ کی بھٹی والے کی طرح سے ہے کہ اگر سیاہی نہ پہنچے تب بھی دھواں تو کہیں گیا ہی نہیں، نہایت ہی اہم بات ہے۔ آدمی کو اپنے ہم نشینوں پر بھی نظر کرنا چاہئے کہ کس قسم کے لوگوں میں ہر وقت نشست و برخاست ہے۔

(۷) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ. (رواہ مسلم)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضورِ اقدس ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ اس کتاب یعنی قرآنِ پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست و ذلیل کرتا ہے۔

یعنی جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، عمل کرتے ہیں، حق تعالیٰ شانہٗ ان کو دنیا و آخرت میں رفعت و عزت عطا فرماتے ہیں اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے حق سبحانہٗ وتقدس ان کو ذلیل کرتے ہیں، کلام اللہ شریف کی آیات سے بھی یہ مضمون ثابت ہوتا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے: "يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا" (البقرۃ: ۲۶) حق تعالیٰ شانہٗ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت فرماتے ہیں اور بہت سے لوگوں کو گمراہ۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا" ۝ (بنی اسرائیل: ۸۲) حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد منقول ہے کہ اس امت کے بہت سے منافق قاری ہوں گے۔ بعض مشائخ سے احیاء میں نقل کیا ہے کہ بندہ ایک سورت کلامِ پاک کی شروع کرتا ہے تو ملائکہ اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ فارغ ہو، اور دوسرا شخص ایک سورت شروع کرتا ہے تو ملائکہ اس کے ختم تک اس پر لعنت کرتے ہیں۔ بعض علماء سے منقول ہے کہ آدمی تلاوت کرتا ہے اور خود اپنے اوپر لعنت کرتا ہے اور اس کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ قرآن شریف میں پڑھتا ہے "اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ" (ہود: ۱۸) اور خود ظالم ہونے کی وجہ سے اس وعید میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح

پڑھتا ہے "لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ" (آلِ عمران:۶۱) اور خود جھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کا مستحق ہوتا ہے۔

عامر بن واثلہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبدالحارث رضی اللہ عنہ کو مکّہ مکرمہ کا حاکم بنا رکھا تھا۔ ان سے ایک دفعہ دریافت فرمایا کہ جنگلات کا ناظم کس کو مقرر کر رکھا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: ابنِ اَبزیٰ کو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ ابنِ ابزیٰ کون شخص ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہمارا ایک غلام ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعتراضاً فرمایا کہ غلام کو امیر کیوں بنا دیا؟ انہوں نے کہا کہ کتاب اللہ کا پڑھنے والا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اس کلام کی بدولت بہت سے لوگوں کے رفع درجات فرماتے ہیں اور بہت سوں کو پست کرتے ہیں۔

(۸) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ثَلٰثٌ تَحْتَ الْعَرْشِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: اَلْقُرْاٰنُ يُحَاجُّ الْعِبَادَ، لَهٗ ظَهْرٌ وَّ بَطْنٌ، وَّ الْاَمَانَةُ، وَالرَّحِمُ تُنَادِيْ: اَلَا مَنْ وَّصَلَنِيْ وَصَلَهُ اللّٰهُ، وَمَنْ قَطَعَنِيْ قَطَعَهُ اللّٰهُ (رواه في شرح السنة)

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ تین چیزیں قیامت کے دن عرش کے نیچے ہوں گی، ایک کلامِ پاک کہ جھگڑے گا بندوں سے، قرآنِ پاک کے لئے ظاہر ہے اور باطن، دوسری چیز امانت ہے اور تیسری رشتہ داری جو پکارے گی کہ جس شخص نے مجھ کو جوڑا اللہ اس کو اپنی رحمت سے ملاوے اور جس نے مجھ کو توڑا، اللہ اپنی رحمت سے اس کو جدا کرے۔

ان چیزوں کے عرش کے نیچے ہونے سے مقصود ان کا کمالِ قرب ہے، یعنی حق سبحانہٗ وتقدس کے عالی دربار میں بہت ہی قریب ہوں گی۔ کلام اللہ شریف کے جھگڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس کی رعایت کی، اس کا حق ادا کیا، اس پر عمل کیا، ان کی طرف سے دربارِ حق سبحانہٗ میں جھگڑے گا اور شفاعت کرے گا، ان کے درجے بلند کرائے گا۔ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ترمذی نقل کیا ہے کہ قرآنِ شریف بارگاہِ الٰہی میں عرض

کرے گا کہ اس کو جوڑا مرحمت فرمائیں تو حق تعالیٰ شانہٗ کرامت کا تاج مرحمت فرماویں گے۔ پھر وہ زیادتی کی درخواست کرے گا تو حق تعالیٰ شانہٗ اکرام کا پورا جوڑا مرحمت فرماویں گے، پھر وہ درخواست کرے گا کہ یا اللہ آپ اس شخص سے راضی ہو جائیں، تو حق سبحانہٗ وتقدس اس سے رضا کا اظہار فرماویں گے اور جب کہ دنیا میں محبوب کی رضا سے بڑھ کر کوئی بھی بڑی سے بڑی نعمت نہیں ہوتی تو آخرت میں محبوب کی رضا کا مقابلہ کون سی نعمت کر سکتی ہے اور جن لوگوں نے اس کی حق تلفی کی ہے ان سے اس بارے میں مطالبہ کرے گا کہ میری کیا رعایت کی، میرا کیا حق ادا کیا۔

شرحِ احیاء میں امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ سال میں دو مرتبہ ختم کرنا قرآن شریف کا حق ہے۔ اب وہ حضرات جو کبھی بھول کر بھی تلاوت نہیں کرتے ذرا غور فرمالیں کہ اس قوی مقابل کے سامنے کیا جواب دہی کریں گے؟ موت بہر حال آنے والی چیز ہے، اس سے کسی طرح مَفَر نہیں۔ قرآن شریف کے ظاہر اور باطن ہونے کا مطلب ظاہر یہ ہے کہ ایک ظاہری معنی ہیں جن کو ہر شخص سمجھتا ہے اور ایک باطنی معنی ہیں جن کو ہر شخص نہیں سمجھتا جس کی طرف حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد نے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص قرآنِ پاک میں اپنی رائے سے کچھ کہے اگر وہ صحیح بھی ہو تب بھی اس شخص نے خطا کی۔ بعض مشائخ نے ظاہر سے مراد اس کے الفاظ فرمائے ہیں کہ جن کی تلاوت میں ہر شخص برابر ہے اور باطن سے مراد اس کے معنی اور مطالب ہیں جو حسبِ استعداد مختلف ہوتے ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر علم چاہتے ہو تو قرآنِ پاک کے معانی میں غور و فکر کرو کہ اس میں اولین و آخرین کا علم ہے، مگر کلامِ پاک کے معنی کے لئے جو شرائط و آداب ہیں ان کی رعایت ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے زمانے کی طرح سے جو شخص عربی کے چند الفاظ کے معنی جان لے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بغیر کسی لفظ کے معنی جانے اردو ترجمے دیکھ کر اپنی رائے کو اس میں داخل کر دے۔ اہلِ فن نے تفسیر کے لئے پندرہ علوم پر مہارت ضروری بتلائی ہے، وقتی ضرورت کی وجہ سے مختصراً عرض کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جاوے گا کہ بطنِ کلامِ پاک تک رسائی ہر شخص کو نہیں ہو سکتی۔

اوّل: لغت جس سے کلامِ پاک کے مفرد الفاظ کے معنی معلوم ہو جاویں۔ مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اس کو جائز نہیں کہ بدونِ معرفت لغاتِ عرب کے کلامِ پاک میں کچھ لب کشائی کرے اور چند لغات کا معلوم ہو جانا کافی نہیں، اس لئے کہ بسا اوقات لفظ چند معانی میں مشترک ہوتا ہے اور وہ ان میں سے ایک دو معنی جانتا ہے اور فی الواقع اس جگہ کوئی اور معنی مراد ہوتے ہیں۔

دوسرے: نحو کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ اِعراب کے تغیّر و تبدُّل سے معنی بالکل بدل جاتے ہیں اور اعراب کی معرفت نحو پر موقوف ہے۔

تیسرے. صَرف کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ بِنا اور صیغوں کے اختلاف سے معانی بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ابنِ فارس رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جس شخص سے علمِ صرف فوت ہو گیا اس سے بہت کچھ فوت ہو گیا۔ علامہ زَمَخشَری رحمۃ اللہ علیہ اُعجوباتِ تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کلامِ پاک کی آیت "یَوۡمَ نَدۡعُوۡا کُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمۡ" (بنی اسرائیل:۷۱) ترجمہ (جس دن کہ پکاریں گے ہم ہر شخص کو اس کے مقتدا اور پیش رو کے ساتھ) اس کی تفسیر "صَرف" کی ناواقفیت کی وجہ سے یہ کی کہ جس دن پکاریں گے ہر شخص کو ان کی ماؤں کے ساتھ، امام کا لفظ جو مفرد تھا اس کو اُمّ کی جمع سمجھ گیا۔ اگر وہ "صَرف" سے واقف ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ اُمّ کی جمع اِمام نہیں ہوتی۔

چوتھے: اشتقاق کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ لفظ جب کہ دو مادوں سے مشتق ہو تو اس کی معنی مختلف ہوں گے جیسا کہ مسیح کا لفظ ہے کہ اس کا اشتقاق مسح سے بھی ہے جس کے معنی چھونے اور تر ہاتھ کسی چیز پر پھیرنے کے ہیں اور مساحت سے بھی ہیں جس کے معنی پیمائش کے ہیں۔

پانچویں: علمِ معانی کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کی ترکیبیں معنی کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔

چھٹے: علمِ بیان کا جاننا ضروری ہے جس سے کلام کا ظہور و خِفا، تشبیہ و کنایہ معلوم ہوتا ہے۔

ساتویں: علمِ بدیع جس سے کلام کی خوبیاں تعبیر کے اعتبار سے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ تینوں[1] فن علمِ بلاغت کہلاتے ہیں۔ مفسّر کے اہم علوم میں سے ہیں، اس لئے کہ کلامِ پاک جو سراسر اِعجاز

[1] معانی، بیان، بدیع

ہےاس سےاس کا اعجاز معلوم ہوتا ہے۔

آٹھویں: علمِ قراءت کا جاننا بھی ضروری ہے اس لئے کہ مختلف قراءتوں کی وجہ سے مختلف معنی معلوم ہوتے ہیں اور بعض معنی کی دوسرے معنی پر ترجیح معلوم ہوجاتی ہے۔

نویں: علمِ عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ کلامِ پاک میں بعض آیات ایسی بھی ہیں جن کے ظاہری معنی کا اطلاق حق سبحانہٗ وتقدّس پر صحیح نہیں، اس لئے ان میں کسی تاویل کی ضرورت پڑے گی جیسے کہ "يَدُاللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ" (الفتح:۱۰)۔

دسویں: اصولِ فقہ کا معلوم ہونا ضروری ہے کہ جس سے وجوہِ استدلال واستنباط معلوم ہوسکیں۔

گیارھویں: اسبابِ نزول کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ شانِ نزول سے آیت کے معنی زیادہ واضح ہوں گے اور بسا اوقات اصل معنی کا معلوم ہونا بھی شانِ نزول پر موقوف ہوتا ہے۔

بارھویں: ناسخ ومنسوخ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے تاکہ منسوخ شدہ احکام "مَعْمُول بِها" سے ممتاز ہوسکیں۔

تیرھویں: علمِ فقہ کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے کہ جزئیات کے احاطہ سے کلیات پہچانے جاتے ہیں۔

چودھویں: ان احادیث کا جاننا ضروری ہے جو قرآنِ پاک کی مجمل آیات کی تفسیر واقع ہوئی ہیں۔

ان سب کے بعد **پندرھواں:** وہ علمِ وہبی ہے جو حق سبحانہٗ وتقدّس کا عطیۂ خاص ہے، اپنے مخصوص بندوں کو عطا فرماتے ہیں جس کی طرف اس حدیث شریف میں اشارہ ہے: مَنْ عَمِلَ بِمَا عَلِمَ وَرَّثَهُ اللّٰهُ عِلْمَ مَالَمْ يَعْلَمْ۔ (جب کہ بندہ اس چیز پر عمل کرتا ہے جس کو جانتا ہے تو حق تعالیٰ شانہٗ ایسی چیزوں کا علم عطا فرماتے ہیں جن کو وہ نہیں جانتا)۔

اسی کی طرف حضرت علی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْہَہٗ نے اشارہ فرمایا جب کہ ان سے لوگوں نے پوچھا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے آپ کو کچھ خاص علوم عطا فرمائے ہیں یا خاص وصایا جو عام لوگوں کے علاوہ آپ کے ساتھ مخصوص ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے جنّت بنائی اور جان پیدا کی، اس فہم کے علاوہ کچھ نہیں ہے جس کو اللہ تعالیٰ شانہٗ اپنے کلامِ پاک کے سمجھنے کے لئے کسی کو عطا فرمادیں۔ ابنِ ابی الدنیا رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ ہے کہ

علوم قرآن اور جو اس سے حاصل ہو وہ ایسا سمندر ہے کہ جس کا کنارہ نہیں۔ یہ علوم جو بیان کئے گئے مفسّر کے لئے بطور آلہ کے ہیں، اگر کوئی شخص ان علوم کی واقفیت کے بغیر تفسیر کرے تو وہ تفسیر بالرائے میں داخل ہے جس کی ممانعت آئی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے علوم عربیہ طبعاً حاصل تھے اور بقیہ علوم مشکوٰۃِ نبوت سے مُستفاد تھے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ شاید تجھے یہ خیال ہو کہ علمِ وہبی کا حاصل کرنا بندہ کی قدرت سے باہر ہے لیکن حقیقت ایسی نہیں بلکہ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ ان اسباب کا حاصل کرنا ہے جس پر حق تعالیٰ شانہٗ اس کو مرتّب فرماتے ہیں، مثلاً علم پر عمل اور دنیا سے بے رغبتی وغیرہ وغیرہ۔

کیمیائے سعادت میں لکھا ہے کہ قرآن شریف کی تفسیر تین شخصوں پر ظاہر نہیں ہوتی: **اوّل**: وہ جو علومِ عربیہ سے واقف نہ ہو۔ دوسرے: وہ شخص جو کسی کبیرہ پر مُصر ہو یا بدعتی ہو کہ اس گناہ اور بدعت کی وجہ سے اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے معرفتِ قرآن سے قاصر رہتا ہے۔ تیسرے: وہ شخص کہ کسی اعتقادی مسئلہ میں ظاہر کا قائل ہو اور کلامُ اللہ کی جو عبارت اس کے خلاف ہو اس سے طبیعت اچٹتی ہو، اس شخص کو بھی فہمِ قرآن سے حصّہ نہیں ملتا۔ **اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُمْ۔**

(۹) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْاٰنِ: اِقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَاِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ اٰخِرِ اٰيَةٍ تَقْرَأُهَا (رواه أحمد و الترمذي وابوداود و النسائي و ابن ماجة، وابن حبان في صحيحه)

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے (کہ قیامت کے دن) صاحبِ قرآن سے کہا جاوے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا، بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

صاحبُ القرآن سے بظاہر حافظ مراد ہے اور ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی تفصیل سے اس کو واضح کیا ہے کہ یہ فضیلت حافظ ہی کے لئے ہے، ناظرہ خواں اس میں داخل نہیں۔

اوّل اس وجہ سے کہ صاحبِ قرآن کا لفظ بھی اسی طرف مُشِیر ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ مُسندِ احمد کی روایت میں ہے "حَتّٰی یَقْرَأَ شَیْئًا مَّعَهٗ" (یہاں تک کہ پڑھے جو کچھ قرآن شریف اس کے ساتھ ہے) یہ لفظ اس امر میں زیادہ ظاہر ہے کہ اس سے حافظ مراد ہے، اگرچہ محتمل وہ ناظرہ خواں بھی ہے جو کہ قرآن شریف بہت کثرت کے ساتھ پڑھتا ہو۔ مرقاۃ میں لکھا ہے: وہ پڑھنے والا مراد نہیں جس کو قرآن لعنت کرتا ہو۔ یہ اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ وہ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان کو لعنت کرتا ہے، اس لئے اگر کسی شخص کے عقائد وغیرہ درست نہ ہوں تو قرآن شریف کے پڑھنے سے اس کی مقبولیت پر استدلال نہیں ہوسکتا، خوارج کے بارے میں بکثرت اس قسم کی احادیث وارد ہوئی ہیں۔

تَرتِیل کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب نَوَّرَ اللّٰہُ مَرقَدَہٗ نے اپنی تفسیر میں تحریر فرمایا ہے کہ ترتیل لغت میں صاف اور واضح طور سے پڑھنے کو کہتے ہیں اور شرعِ شریف میں کئی چیزوں کی رعایت کے ساتھ تلاوت کرنے کو کہتے ہیں۔ اوّل حرفوں کو صحیح نکالنا یعنی اپنے مخرج سے پڑھنا تا کہ "طا" کی جگہ "تا" اور "ضاد" کی جگہ "ظا" نہ نکلے۔ دوسرے وقوف کی جگہ پر اچھی طرح سے ٹھہرنا تا کہ وصل اور قطع کلام کا بے محل نہ ہو جاوے۔ تیسرے حرکتوں میں اِشباع کرنا یعنی زیر، زبر و پیش کو اچھی طرح سے ظاہر کرنا۔ چوتھے آواز کو تھوڑا سا بلند کرنا تا کہ کلامِ پاک کے الفاظ زبان سے نکل کر کانوں تک پہنچیں اور وہاں سے دل پر اثر کریں۔ پانچویں آواز کو ایسی طرح سے درست کرنا کہ اس میں درد پیدا ہو جاوے اور دل پر جلدی اثر کرے کہ درد والی آواز دل پر جلدی اثر کرتی ہے اور اس سے روح کو قوت اور تاثُّر زیادہ ہوتا ہے، اسی وجہ سے اَطِبّاء نے کہا ہے کہ جس دوا کا اثر دل پر پہنچانا ہو اس کو خوشبو میں ملا کر دیا جائے کہ دل اس کو جلدی کھینچتا ہے اور جس دوا کا اثر جگر میں پہنچانا ہو اس کو شیرینی میں ملایا جائے کہ جگر مٹھائی کا جاذب ہے، اسی وجہ سے بندہ کے نزدیک اگر تلاوت کے وقت خوشبو کا خاص استعمال کیا جاوے تو دل پر تاثیر میں زیادہ تقویت ہوگی۔ چھٹے تشدید اور مد کو اچھی طرح ظاہر کیا جاوے کہ اس کے اظہار سے کلامِ پاک میں عظمت ظاہر ہوتی ہے

اور تاثیر میں اعانت ہوتی ہے۔ ساتویں آیاتِ رحمت وعذاب کا حق ادا کرے جیسا کہ تمہید میں گذر چکا۔ یہ سات چیزیں ہیں کہ جن کی رعایت ترتیل کہلاتی ہے اور مقصود ان سب سے صرف ایک ہی ہے یعنی کلامِ پاک کا فہم وتدبُّر۔ حضرت اُمّ المؤمنین اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کلامُ اللہ شریف کس طرح پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ سب حرکتوں کو بڑھاتے تھے یعنی زیر، زبر، وغیرہ کو پورا نکالتے تھے اور ایک ایک حرف الگ الگ ظاہر ہوتا تھا، ترتیل سے تلاوت مستحب ہے اگرچہ معنی نہ سمجھتا ہو۔

اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں ترتیل سے اَلْقَارِعَةُ اور اِذَا زُلْزِلَتْ پڑھوں یہ بہتر ہے اس سے کہ بلا ترتیل سورۂ بقرہ اور اٰلِ عمران پڑھوں۔

شُرّاح اور مشائخ کے نزدیک حدیثِ بالا کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی ایک ایک آیت پڑھتا جا اور ایک ایک درجہ اوپر چڑھتا جا، اس لئے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنّت کے درجات کلام اللہ شریف کی آیات کے برابر ہیں، لہٰذا جو شخص جتنی آیات کا ماہر ہوگا اتنے ہی درجے اوپر اس کا ٹھکانہ ہوگا اور جو شخص تمام کلامِ پاک کا ماہر ہوگا وہ سب سے اوپر کے درجے میں ہوگا۔

مُلّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے حدیث میں وارد ہے کہ قرآن پڑھنے والے سے اوپر کوئی درجہ نہیں، پس قُرّاء آیات کی بقدر ترقی کریں گے اور علامہ دانی رحمۃ اللہ علیہ سے اہلِ فن کا اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ قرآن شریف کی آیات چھ ہزار (۶۰۰۰) ہیں، لیکن اس کے بعد کی مقدار میں (یعنی تعداد میں) اختلاف ہے اور اتنے اقوال نقل کئے ہیں: ۲۰۴۔ ۱۴۔۱۹۔۲۵۔۳۶۔

شرحِ احیاء میں لکھا ہے کہ ہر آیت ایک درجہ ہے جنّت میں، پس قاری سے کہا جاوے گا کہ جنّت کے درجات پر اپنی تلاوت کے بقدر چڑھتے جاؤ۔ جو شخص قرآنِ پاک تمام پورا کرلے گا وہ جنّت کے اعلیٰ درجے پر پہنچے گا اور جو شخص کچھ حصّہ پڑھا ہوا ہوگا وہ اس کی بقدر درجات پر پہنچے گا۔ بالجملہ منتہائے ترقی منتہائے قراءت ہوگی۔ بندہ کے نزدیک حدیثِ بالا کا مطلب کچھ اور معلوم ہوتا ہے، فَاِنْ کَانَ صَوَابًا فَمِنَ اللّٰهِ وَاِنْ کَانَ خَطَأً